دعا نمبر ۲۶

''عباد الرحمٰن'' پہلا حصہ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ
اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا نمبر ۲۶ ''عباد الرحمٰن'' پہلا حصہ

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اپنے نیک بندوں کی وہ صفات ذکر فرمائی ہیں جو اللہ جل شانہ کو پسند ہیں اور جن کا حاصل کرنا ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے اور اس کے بغیر نہ دنیا درست ہوسکتی ہے اور نہ آخرت درست ہوسکتی ہے۔ ان مختلف مقامات میں سے ایک مقام ''سورۂ فرقان'' کا آخری رکوع ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ''رحمٰن کے بندوں'' کا عنوان اختیار فرما کر وہ صفات بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا

خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا [1]

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کا لقب

فرمایا کہ ''رحمٰن'' کے بندے وہ ہیں، کون ہیں؟ جن کی صفات آگے بیان کی گئی ہیں۔ اس کا عنوان ہی یہ بتا رہا ہے کہ ان کی اصل صفت جو اللہ جل جلالہ کو محبوب ہے اور جو اُن کے لئے طرۂ امتیاز کے طور پر بیان کی گئی ہے وہ ''بندگی'' ہے ''رحمٰن کے بندے'' دنیا میں اگر کسی کو بڑا کہا جائے تو اس کے لئے طرح طرح کے القاب استعمال ہوتے ہیں، لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے نیک بندوں کا جو ''لقب'' اختیار فرمایا ہے وہ ''لقب'' بھی بڑا پیارا ہے کہ یہ ''رحمٰن کے بندے'' ہیں۔ یعنی ان کی اصل صفت ''بندگی'' ہے۔ ان لوگوں نے اپنے دل میں بٹھا لیا ہے کہ میں ''رحمٰن کا بندہ'' ہوں۔

''رحمٰن'' کی صفت سے اشارہ

''رحمٰن'' کی صفت لا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ واللہ سبحانہ اعلم جس ذات نے کسی کو رحمتوں سے ڈھانپا ہوا ہو۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کی رحمتیں ہیں، جن میں انسان ڈھکا ہوا ہے تو اس ذات کا ''جو بندہ'' ہوگا وہ اپنے آقا کا سب سے زیادہ فرمانبردار ہوگا۔ ''آقا'' سے بہت زیادہ محبت کرنے والا ہوگا۔ ''آقا'' کی ہر بات کو ماننے والا ہوگا اور اس کے اشاروں کو بھی دیکھنے والا ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ''غلامی'' کا نظام اس وقت نہیں ہے، لیکن جس زمانے میں غلامی کا

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۳)

نظام تھا تو جو آقا ہوتا تھا وہ غلام کے لئے سب کچھ ہوتا تھا۔ یعنی وہ آقا غلام کا مالک ہوتا تھا اور ''مالک'' ہونے کے ناطے وہ غلام سے جو کام چاہتا کروالیتا تھا۔

ظالم آقا کے غلام کا طرزِ عمل

فرض کرو کہ آقا جابر اور ظالم قسم کا ہے اور وہ غلام کو کوڑے مار کر کام کراتا ہے، وہ ''غلام'' اس ظالم کے کام تو پھر بھی کرے گا، کیونکہ وہ غلام ہے تو وہ تو کام کرے گا، اب چاہے خوشی سے کرے، چاہے ناراضگی سے کرے، لیکن اس غلام کے دل میں ایسے ظالم آقا کے لئے ایسا جذبہ نہیں ہوگا کہ وہ یہ سوچے کہ یہ میرا آقا ہے تو میں اس کی ہر بات مانوں۔ ہر وقت اس غلام کو ''کوڑا'' نظر آرہا ہے، اس کی وجہ سے وہ اس آقا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے، لیکن اس کے دل میں آقا کی کوئی محبت نہیں۔ اس لئے کہ وہ ظالم اور جابر ہے۔

خیال رکھنے والے آقا کے غلام کا طرز

اور ایک آقا وہ ہے جو صبح سے لے کر شام تک اپنے غلام کا خیال رکھتا ہے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ ہو، یہ آرام سے رہے اور اس کی نیند بھی پوری ہو، اور کوئی کام ایسی مشقت کا اس سے نہ لوں جو اس پر بھاری ہوجائے، پیار سے اس کو پکارتا ہے، پیار سے اس سے معاملہ کرتا ہے، پیار سے اس کو کوئی حکم دیتا ہے۔ پیار سے اس سے باتیں کرتا ہے، ایسے آقا کا جو غلام ہوگا، وہ اپنے آقا پر فریفتہ ہوگا کہ یہ آقا تو مجھے مار بھی سکتا ہے، مجھے ڈانٹ بھی سکتا ہے، لیکن اس آقا نے مجھے اتنا پیار سے رکھا ہوا ہے، اتنی شفقت اور محبت سے رکھا ہوا ہے کہ میں اس کی

شفقتوں میں نہال ہوں۔ اس غلام کے دل میں آقا کی جو محبت ہوگی، اس کی جو عظمت ہوگی، وہ پہلے والے غلام کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگی۔

"الرحمٰن" کی صفت لانا

اسی طرح یہاں پر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو فرمایا کہ "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" اب دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے "عباد الجبار" نہیں فرمایا "عباد القهار" نہیں فرمایا بلکہ "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" فرمایا کہ یہ "رحمٰن" کے بندے ہے، جس "رحمٰن" نے ان کو اپنی نعمتوں میں نہلایا ہوا ہے اور یہ دل میں اس بات کا تصور رکھتے ہیں کہ میں ایک ایسی ذات کا بندہ ہوں اور اس کا غلام ہوں، جس کی نعمتوں میں صبح سے لے کر شام تک نہایا ہوا ہوں جو بندہ دل میں یہ بات رکھے گا کہ میں "رحمٰن" کا بندہ ہوں تو وہ بندہ اس کی اطاعت، اس کی تابعداری، اس کی فرمانبرداری محض زور زبردستی سے نہیں کرے گا۔ بلکہ دل سے اس کی فرمانبرداری کرے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا تمغہ کوئی اور نہیں ہوسکتا، جو تمغہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کے عنوان سے دیا ہے جو تمغہ آقا اپنے غلام کو دے یا جو مالک اپنے بندے کو دے "بندگی" ان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔

"عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی پہلی صفت: "تواضع"

ان کی "بندگی" کا جو مظاہرہ ہے، وہ ان صفات سے واضح ہے، چنانچہ ان کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ:

الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

یعنی ''رحمٰن'' کے بندے وہ ہیں جو زمین پر ''عاجزی'' سے چلتے ہیں اور اگر نادان لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو یہ سلامتی کی بات کرتے ہیں۔

اب یہاں ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی سب سے پہلی صفت جس کو سب سے مقدم فرمایا، وہ یہ بیان فرمائی کہ وہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ زمین پر عاجزی سے کیوں چلتے ہیں؟ اس لئے عاجزی سے چلتے ہیں کہ دل میں ''تواضع'' ہے اور اس کے ذریعہ سے ''تواضع'' کی تعریف کرنا مقصود ہے اور اس کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہے۔ نماز کا ذکر بعد میں آرہا ہے، لیکن پہلا وصف جو مطلوب ہے، وہ ہے ''تواضع'' اور ''بندگی'' کا پہلا سبق ''تواضع'' ہے۔

''تواضع'' کے معنیٰ

''تواضع'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ ''تواضع'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان دل میں یہ سمجھے کہ میری کوئی حقیقت نہیں۔ دل میں یہ سمجھے، صرف زبان سے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا، اگر زبان سے یہ کہہ دیا کہ'' میں ناچیز ہوں''، ''ناکارہ ہوں'' صرف یہ تواضع نہیں ہے۔ جب تک دل میں بھی یہ بات نہ ہو کہ واقعی میری کوئی حقیقت نہیں، میں تو گندہ قطرہ تھا، اس گندے قطرے کو ہی میرے مالک نے خون بنادیا، اس کو لوتھڑا بنادیا، اس کی ہڈیاں بنادی اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا: ''ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ'' پھر ہم نے اس کو ایک اور چیز ہی بنا دیا۔ ''فَتَبٰرَكَ

اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ‘‘(۱)۔

انسان اپنے کمالات میں گم رہتا ہے

اگر آدمی کو اپنی یہ حقیقت مستحضر رہے تو یہ ’’تواضع‘‘ ہے، ورنہ زبان سے کہنے کو تو میں بھی کہہ لوں گا اور ہر آدمی کہہ دے گا کہ ’’میری کوئی حقیقت نہیں ہے‘‘ لیکن کسی متواضع کی صحبت کے بغیر یہ بات دل میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان اپنے ہی ’’کمالات‘‘ میں گم رہتا ہے، میں یہ ہوں، میں وہ ہوں، میرا علم دیکھو، میرا کمال دیکھو، میری تجارت دیکھو، میری دولت دیکھو، میرا مکان دیکھو، میری کار دیکھو، میرے اثرات دیکھو، میری شہرت دیکھو، لوگوں میں میری مقبولیت دیکھو۔ انسان بس اس میں گم رہتا ہے۔ عقیدے کے اعتبار سے پوچھو تو وہ یہ کہے گا کہ میری حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ عقیدہ تو ہے، لیکن ’’عقیدہ‘‘ اور چیز ہے اور اس ’’عقیدے‘‘ کے نتیجے میں زندگی پر اس کا ’’عکس‘‘ یہ اور چیز ہے۔

اپنی ظاہری خوبیوں کا ’’مراقبہ‘‘ کرتا رہتا ہے

اس لئے کہ دن رات جس چیز میں وہ گم ہے، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ میں عالم ہوں، میری اتنی تصانیف ہیں، میرے اتنے بیانات ہیں، اتنے لوگ میرے گرویدہ ہیں، میری بات کا لوگوں پر اثر ہوتا ہے۔ لوگ میرے گرد گھومتے ہیں، چار دانگِ عالم میں میرا شہرہ ہے، تجارت میں میرا اعلیٰ مقام ہے، دوسرے لوگ

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۱٤)

میرے آگے کیا ہیں؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ ''عقل'' تو کہہ رہی ہے کہ تو کچھ نہیں ہے، لیکن ''دماغ'' اور ''عملی جذبات'' اس حقیقت پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور انسان اپنی ظاہری خوبیوں کا ''مراقبہ'' کرتا رہتا ہے۔

کمالات پر نظر کا اثر چال ڈھال پر

حالانکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ''مراقبہ'' کرنا تھا، اور اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کرنا تھا، لیکن انسان ہر وقت اس مراقبہ میں رہتا ہے کہ ''میں نے یہ کام اچھا کرلیا''، ''یہ کام میں نے اچھا کرلیا''، ''مجھے یہ کمال حاصل ہوگیا'' بس! صبح شام اس کے مراقبہ میں لگا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''تواضع'' اصل نہیں، بلکہ اپنے کمالات پر نظر ہے کہ ان کمالات کی وجہ سے مجھے دوسروں پر فوقیت حاصل ہے اور کمالات پر نظر کا اثر انسان کی چال ڈھال پر پڑتا ہے۔ اب چلے گا تو ذرا اکڑ کر چلے گا اور یہ سمجھ کر چلے گا کہ میں بڑا ہوں اور دوسرے چھوٹے ہیں۔ میں کامل ہوں۔ دوسرے ناقص ہیں۔ میں افضل ہوں۔ دوسرے فضول ہیں، اس لئے جب وہ چلے گا تو سینہ تان کر چلے گا۔

تواضع کا اثر چال ڈھال پر

اور جس شخص کے دل میں ''تواضع'' عقیدۃً ہی نہیں، بلکہ مراقبۃً اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے، اس کو اپنا کوئی کارنامہ نظر ہی نہیں آتا۔ اس کے دل میں تواضع کی بنیاد پڑچکی ہوگی اور اس کا ''مراقبہ'' کرتا ہوگا تو اس کی تواضع کا اثر اس کی چال ڈھال پر بھی ظاہر ہوگا، کیا اثر ظاہر ہوگا کہ:

الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا [1]

کہ وہ لوگ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔

عاجزی سے چلنے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان بہ تکلف اپنے آپ کو عاجز بنا کر چلے۔ اگر بہ تکلف عاجز بنا کر چلے گا تو یہ ''عین تکبر'' ہے اور ''عین ریا کاری'' ہے۔ عاجزی سے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔ یقین کریں کہ حقیقی متواضع جب چل رہا ہوتا ہے تو جتنے آدمی اس کو نظر آرہے ہوتے ہیں، ان سب سے اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے اور جب اپنے آپ کو کمتر سمجھے گا تو وہ کیسے اکڑے گا؟ ایسا شخص طبعًا ہی عاجزی کے ساتھ چلے گا۔

ایسی چال تواضع کے منافی نہیں

اگر کسی کی طبعی رفتار ہی اس قسم کی ہو کہ اور ایسی رفتار تکبر کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے اور نہ وہ تکلف کر رہا ہے اور وہ کسی دوسرے کو حقیر نہیں سمجھتا، وہ جانتا ہے کہ میں تکبر کرنے والا نہیں ہوں، ایسے شخص کی چال میں اس طرح کی کوئی چیز نظر آ بھی جائے تو وہ اس کے تواضع کے منافی نہیں، لیکن جو آدمی تکلف کے ساتھ چلے اور اس تکلف ہی کو اپنی عادت بنا لے اس کے بارے میں فرمایا:

لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا [2]

زمین پر اکڑ کر مت چلا کرو۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (٦٣)

(۲) سورۃ الاسراء: آیت (٣٧)

بہر حال! انسان پر تکبر کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ بعض اوقات اس کی چال پر بھی آجاتے ہیں۔ اس لئے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ: ''اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا''۔

''تکبر'' کا اثر آواز پر

بعض اوقات انسان کے تکبر کا اثر اس کی آواز پر بھی آجاتا ہے، اس لئے کہ جب طبیعت میں تکبر ہے اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو ایسے شخص کی آواز بھی بلند ہوجاتی ہے۔ اور ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ سب لوگ بیوقوف ہیں، میں عقلمند ہوں۔ جو بات میں بولوں گا، اور جو میں سوچوں گا، وہی افضل ہوگی۔ کسی دوسرے کی بات قابلِ قبول نہیں، بس میری بات قابلِ قبول ہے۔ میں جو کہوں وہ سچ اور حق ہے اور دوسرے لوگ اس کے خلاف کہہ رہے ہیں تو وہ غلط ہیں، بیوقوف ہیں، پاگل ہیں، بد سلیقہ ہیں اور جب ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے تو ایسے شخص کی آواز بھی بلند ہوجاتی ہے۔

حضرت لقمان رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے بیٹے کو نصیحت

حضرت لقمان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائیں، وہ سورۂ لقمان میں آئی ہیں، اس نصیحت میں انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۱)

---

(۱) سورۃ لقمان: آیت (۱۹)

یعنی اپنی چال میں بھی اعتدال رکھو۔ یعنی تکلف نہ کرو، جیسی طبعی چال ہے اس کے مطابق چلو، نہ تکبر و کرو، نہ تواضع تکلفاً اختیار کرو۔ اور اپنی آواز کو پست رکھو، زور سے بولنے سے منع فرمایا اور پھر آگے زور سے بولنے کو تشبیہ دی کہ:

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ

کہ ساری مخلوقات کی آوازوں میں سب سے بھدی آواز گدھے کی ہوتی ہے وہ بلند آواز سے بولتا ہے۔

''تواضع'' مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے

لہٰذا عاجزی سے چلنا، اور دھیمے انداز میں گفتگو کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ دل میں ''تواضع'' کی شمع روشن ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی۔ لیکن یہ چیز بڑے مجاہدات سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اپنی حقیقت سمجھے کہ ''میں کچھ نہیں ہوں'' اور جب کسی انسان کو دنیا میں کچھ اوصاف عطا ہو جاتے ہیں، مثلاً کوئی اعلیٰ درجے کا عالم بن گیا، کوئی اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر بن گیا، کوئی اعلیٰ درجے کا انجینئر بن گیا۔ اب ایسا شخص اپنے کمال کی نفی تو نہیں کر سکتا۔ مثلاً جو شخص عالم ہے، وہ یہ تو نہیں کہے گا کہ میں نے درسِ نظامی نہیں پڑھا ہے۔ لہٰذا جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں درسِ نظامی کا فاضل ہوں، یا میں ڈاکٹر ہوں یا میں انجینئر ہوں، لیکن اس کے دل میں یہ بات ہے کہ میں حقیقت میں خود سے کچھ نہیں ہوں، بلکہ میرے مالک نے مجھے ایسا بنایا ہے، یہ اس کی عطا ہے۔ میں اگر دولتمند ہوں تو یہ خود سے نہیں ہوں، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے۔

شیطان انسان کو کیا سبق پڑھاتا ہے؟

اس بات کا استحضار رکھنا اور دھیان رہنا، مجاہدات اور بزرگوں کی صحبت سے ہوتا ہے، ورنہ شیطان انسان کو اسی چکر میں لگائے رکھتا ہے کہ تو ہی سب کچھ ہے، اگر کوئی اس سے پوچھے تو وہ یہ کہے گا کہ میرا یہ عقیدہ ہے، میرا یقین ہے کہ میری حقیقت کچھ نہیں، جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لیکن خدا کے بندے تیرا طرزِ عمل کیا ہے؟ تو طرزِ عمل سے ظاہر کرتا ہے کہ ''میں کچھ کمال رکھتا ہوں''۔

''اکمل'' سمجھنا جائز ہے

بزرگوں نے ایک بات یہ بھی بیان فرمائی کہ اپنے آپ کو ''اکمل'' سمجھنا تواضع کے خلاف نہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ''افضل'' سمجھنا غلط ہے۔ ''اکمل'' سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھنا کہ دوسروں کے مقابلے میں مجھے یہ کمال زیادہ حاصل ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے MA اور PHD کرلیا ہے وہ یہ سمجھے کہ یہ میٹرک کرنے والا مجھ سے زیادہ کامل نہیں ہے یا وہ یہ سمجھے کہ میں نے جو ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ اس کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی ہیں تو ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔

''اکمل'' سمجھنا بھی تکبر ہوجاتا ہے

لیکن دو خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ اس شخص کا یہ سمجھنا کہ میں فلاں سے زیادہ پڑھا ہوا ہوں، لیکن یہ پڑھائی کا کمال کیا مجھے خود حاصل ہوگیا؟ کیا میرے اندر بذاتِ خود ایسی بات تھی کہ جس کے نتیجے میں یہ کمال حاصل ہوجاتا ہے؟ نہیں! بلکہ یہ ''کمال'' اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس بات کا مراقبہ، استحضار اور دھیان

نہیں ہے تو پھر انسان کا اپنے کو دوسرے سے کسی صفت میں ''اکمل'' سمجھنا بھی تکبر ہے۔

''افضل'' سمجھنا کسی طرح بھی جائز نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ ''اکمل'' سمجھنا تو چلو درست ہے، لیکن ''افضل'' سمجھنا! یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ تجھے کیا پتہ کہ کون ''افضل'' ہے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ (١)

بعض لوگ جن کے بال پراگندہ، غبار آلود، اور اگر کسی کے دروازے پر جائیں تو لوگ دھکے دے کر نکال دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا یہ مقام ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ پر کوئی قسم بھی کھالیں کہ ''اللہ کی قسم! یہ کام ہوگا'' تو اللہ تعالیٰ وہ کام کروالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے قرب کا یہ مقام ہوتا ہے۔

میں اس شخص سے افضل ہوں

ایک آدمی ہے، جس کی داڑھی نہیں ہے اور مسجد میں بھی نہیں آتا، پتہ نہیں کہ نماز پڑھتا ہے یا نہیں؟ آوارہ لوگوں کے ساتھ پھر رہا ہے، آپ یہ کہیں کہ میں اس شخص سے افضل ہوں، کیونکہ یہ آوارہ پھر رہا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیا پتہ

(١) صحیح مسلم ٤ / ٢٠٢٤ (٢٦٢٢)

اس کا کون سا کام اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس کو تم حقیر سمجھنے لگو اور اپنے آپ کو اس سے افضل سمجھو، یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں اور یہ تکبر ہے۔

اپنی حقیقت سامنے رکھو

بہر حال! ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ یعنی تواضع اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی حقیقت ہر وقت سامنے رکھو کہ تم کیا ہو؟ تم کیا تھے؟ اور اب کیا ہو؟ کیا تم اپنی قوت بازو سے اس حالت تک پہنچے ہو؟ یا اپنے ذاتی کمالات کے نتیجے میں اس حالت میں پہنچے ہو؟ یا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوئے؟ اس بات کا جب آدمی بار بار مراقبہ کرتا ہے اور استحضار کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں وہ تواضع پیدا فرما دیتے ہیں جو تواضع مطلوب ہے۔

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی دوسری صفت

پھر ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا:

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۱)

یعنی جب جاہل لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو یہ سلامتی کی بات کرتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۳)

اور ''جاہل'' کے معنیٰ ''نادان'' کے ہوتے ہیں۔ یعنی نادان لوگ جب ان سے بات کرتے ہیں تو یہ لوگ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ اب ایک شخص صحیح کام کر رہا ہے اور دوسرا شخص بلاوجہ اس پر اعتراض کر رہا ہے۔ وہ بلاوجہ اعتراض اس لئے کر رہا ہے کہ اس کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں ہے، وہ جاہل، نادان ہے، اس لئے اعتراض کر رہا ہے۔

''جہالت'' کے معنیٰ ''لڑائی جھگڑا''

''جہالت'' کے دوسرے معنیٰ ہوتے ہیں ''لڑائی جھگڑا'' عربی زبان میں ''جہالت'' کا لفظ لڑائی جھگڑے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سبعہ معلقہ کا ایک شعر ہے:

اَلَا لَایـجهلن احد علینا
فنجهل فوق جهل الجاهلین(۱)

کوئی ہمارے ساتھ جہالت کی بات نہ کرے، یعنی لڑائی نہ کرے، ورنہ پھر ہم بھی اس کے ساتھ جہالت کا ایسا معاملہ کریں گے کہ جاہلوں سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

اب شعر میں جہالت سے مراد لڑائی ہے "جَاهِلُوْنَ" کے معنیٰ اس آیت میں جھگڑے کے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب جھگڑا کرنے والے لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو یہ اس کے جواب میں "سَلَامًا" کہتے ہیں۔

---

(۱) سبعہ معلقة، پانچواں معلقہ، معلقہ عمرو بن کلثوم تغلبی

"سَلٰمًا" کے دو مطلب

"سَلٰمًا" کے بھی دو مطلب ہیں، ایک مطلب یہ ہے کہ وہ سلامتی کی بات اور شرافت کی بات کہتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ لفظ "سلام" کہتے ہیں اور سلام سے مراد رخصتی، کہ معاف کرنا، اب آئندہ میں آپ سے کچھ بات کرنے والا نہیں ہوں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا تھا کہ:

سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ [1]

اور دوسری جگہ قرآنِ کریم نے خود کہا کہ:

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ [2]

ایک "سلام" وہ ہوتا ہے جس کا مقصد سلامتی کی دعا دینا اور "تحیۃ" کرنا "السلام علیکم" اور ایک سلام ہوتا ہے "رخصتی والا" کہ اچھا بھائی! "السلام علیکم" یعنی اب ہم تم سے بات نہیں کریں گے، اب ہم جا رہے ہیں۔

"جھگڑا" اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے

لٰهذا "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی ایک صفت یہ ہے کہ جب جاہل لوگ جھگڑا کرنے والے ان سے کوئی خطاب کرتے ہیں تو جواب میں یہ لوگ ایسا نہیں

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (٤٧)

(۲) سورۃ القصص: آیت (٥٥)

کرتے کہ یہ بھی جہالت پر اتر آئیں۔ نہیں! بلکہ یہ لوگ ان کے ساتھ ''سلامتی'' کی بات اور شرافت کی بات کرتے ہیں اور ان کے ساتھ جھگڑے میں نہیں پڑتے۔

یہ ''جھگڑا'' اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے اور انتہائی مکروہ چیز ہے یہ وہ چیز ہے جس کی خاطر ''شبِ قدر'' کی تعیین اٹھائی گئی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر کی تاریخ بتا دی گئی تھی کہ فلاں تاریخ کو شبِ قدر ہوگی۔ لیکن جب تاریخ بتانے کیلئے باہر نکلے تو آپ نے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس لڑائی کی نحوست کی وجہ سے آپ بھول گئے کہ وہ کون سی رات تھی اور اللہ تعالیٰ کو بھلانا بھی مقصود تھا۔ (۱)

''جھگڑا'' علم کا نور لے کر چلا جاتا ہے

فرمایا کہ ''جھگڑا کرنا'' شیطان کو اپنے گھر میں مقیم کرنے کے مترادف ہے۔ چاہے گھر والے آپس میں جھگڑا کر رہے ہوں یا کسی باہر کے آدمی سے جھگڑا کر رہے ہوں۔ یہ جھگڑا ''روحانیت'' کو ختم کر دیتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلْمِرَاءُ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ (۲)

فرمایا کہ ''جھگڑا'' علم کا نور لے کر چلا جاتا ہے، علم کا نور زائل کر دیتا ہے۔ تم اچھے خاصے آدمی ہو، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہو، قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے

(۱) صحيح البخاری ۳ / ٤٧ (۲۰۲۳)

(۲) ترتیب المدارك باب اتباعه السنن ۲ / ۳۹

ہو، نماز پڑھتے ہو، نفلیں پڑھتے ہو، لیکن طبیعت میں جھگڑا کرنے کی عادت ہے، ذرا ذراسی بات پر لوگوں سے الجھ جاتے ہو، جھگڑا شروع کر دیتے ہو تو ذکر کرنے سے، تلاوت سے اور نمازیں پڑھنے سے جو نور پیدا ہوا تھا، وہ سب نور اس لڑائی جھگڑے کے نتیجے میں ختم ہو جائے گا۔

''مناظرہ'' آج کل بھی جھگڑا ہے

میں کہتا ہوں کہ جھگڑا ''روحانیت'' کا نور زائل کر دیتا ہے وہ چاہے ہاتھا پائی کا جھگڑا ہو یا باتوں کا جھگڑا ہو کہ یہ اس کو برا بھلا کہہ رہا ہے وہ اس کو برا بھلا کہہ رہا ہے، یہ اس کی تردید کر رہا ہے، وہ اس کی تردید کر رہا ہے۔ یا ''مناظرے'' کی طرح ہو اس لئے آج کل کے ''مناظرے'' درحقیقت جھگڑے ہیں۔ ''مناظرہ'' کے اصل معنیٰ تھے ''اجتماعی غور وفکر'' اور ''نظر کرنا'' یعنی غور کرنا ''مناظرہ'' بابِ مفاعلہ سے ہے اور بابِ مفاعلہ کی خاصیت مشارکت ہے۔ یعنی باہم بیٹھ کر غور وفکر کرنا کہ اس کا کیا مطلب ہونا چاہئے۔ اس کا کیا نتیجہ نکلنا چاہئے؟ اور غور وفکر کے اندر ایک دوسرے کو سمجھانے میں مدد کر رہے ہیں۔ یہ تھا اصل ''مناظرہ'' لیکن آج کل مناظرہ ''مجادلہ'' یعنی جھگڑے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

''مناظرے'' سے فائدہ نہیں ہوتا

اس لئے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ ''مناظرے'' سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ الاّ یہ کہ بعض خاص خاص مقامات پر ''مناظرے'' کی ضرورت پڑ جاتی

ہے۔ جیسے وہ لوگ جو کھلے اہلِ باطل ہیں۔ ان کے ساتھ بعض اوقات مناظرے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ بہر حال! یہ جو فرمایا کہ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی یہ صفت بیان فرمائی کہ جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو یہ ان سے ''سلامتی'' کی بات کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھگڑے سے پرہیز کرتے ہیں۔

جھگڑا چھوڑنے پر جنت کی بشارت

''رحمٰن'' کے بندے ہونے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ''تواضع'' ہو اور دوسرے یہ کہ ''جھگڑے'' سے پرہیز ہو، اگر یہ بات ہمارے دل میں بیٹھ جائے تو ہماری بہت سی بیماریاں خود بخود ختم ہو جائیں، بہت ساری بیماریاں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ ''تواضع'' کی حقیقت حاصل نہیں اور جھگڑے کی شناعت دل میں نہیں ہے۔ آدمی سب کچھ گوارہ کر لے، لیکن جھگڑے سے پرہیز کرے۔ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ اَعْلَى الْجَنَّةِ وَ بِبَيْتٍ فِيْ وَسْطِ الْجَنَّةِ وَ بِبَيْتٍ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَآءَ وَهُوَ مُحِقٌّ (۱)

میں اس شخص کو جنت کے اندر گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے، حق پر ہے، اور چاہے اپنے حق کو ثابت کر سکتا ہے اور اس حق کے مطابق اپنا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، لیکن وہ یہ سوچتا ہے کہ کون

---

(۱) سنن أبي داؤد ۵ / ۳۵۵ (٤٧٦٧) والمعجم الكبير للطبراني ۸ / ۱۸۶ (۷۷۷۰) ومسند الرویانی ۲ / ۲۷۹ (۱۲۰۰)، وسنن الترمذی ۳/ ۵۳۰ (۱۹۹۳) وقال هذا الحديث حديث حسنٌ.

اس جھگڑے میں پڑے۔

جائیداد پر شوہر اور بیوی کے جھگڑے کا واقعہ

مجھے یاد آیا۔ حضرت والد صاحب کے زمانے میں ایک خاتون تھیں، ان کا اپنے شوہر سے بہت جھگڑا رہتا تھا اور جھگڑے کی بنیاد یہ تھی کہ ایک جائیداد تھی۔ بیوی کہتی کہ یہ جائیداد میری ہے اور شوہر کہتا کہ یہ جائیداد میری ہے۔ کچھ دلائل بیوی کے حق میں جا رہے تھے اور کچھ دلائل شوہر کے حق میں جا رہے تھے۔ حضرت والد صاحب نے ان خاتون کو یہ حدیث سنائی کہ دیکھو حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ خاتون نے کہا: اچھا جی! جب حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلانے کی ذمہ داری لی ہے تو پھر یہ گھر کیا چیز ہے؟ میں بس گھر کو چھوڑتی ہوں اور دست بردار ہوتی ہوں۔ بس لڑائی ختم ہوگئی۔ یہ جھگڑا بڑی خراب چیز ہے۔

خلاصہ

آج کی مجلس میں ہمیں یہ دو سبق ملے۔ ایک یہ کہ اپنی حقیقت سمجھ کر ہر اس عمل سے پرہیز کرنا جس میں سے تکبر کی بو آتی ہو۔ چاہے وہ چال ڈھال میں ہو، چاہے گفتگو میں ہو، چاہے آواز بلند کرنے میں ہو، چاہے جھگڑے میں ہو۔ اور دوسرا سبق یہ ہے کہ حتی الامکان لڑائی جھگڑوں سے اجتناب کرنا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۶

''عباد الرحمٰن'' دوسرا حصہ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ

هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۲۶ ''عباد الرحمٰن'' دوسرا حصہ

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ اتوار کو میں نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے بارے میں عرض کیا تھا کہ مناجاتِ مقبول میں آگے جو دو دعائیں آنے والی ہیں۔ ان کا تعلق ''سورۃ الفرقان'' سے ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی آیات ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی عظیم صفات کا مجموعہ ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ''رحمٰن کے بندے'' قرار دیا ہے۔ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی سب سے پہلی صفت جو بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ

الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (۱)

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۳)

یعنی رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ یعنی اکڑ کر نہیں چلتے۔ کیونکہ اکڑ کر چلنا یا سینہ تان کر چلنا، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

بندگی کا پہلا تقاضا ''تواضع''

قرآنِ کریم میں ''سورۂ بنی اسرائیل'' میں فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا [1]

یعنی زمین پر اکڑ کر مت چلا کرو، کیونکہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ تم لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی بندگی کا خیال کرو اور اکڑ کر مت چلو۔ بلکہ عاجزی سے چلو۔

لہٰذا سب سے پہلے جو صفت بیان فرمائی، وہ یہ ہے کہ ''رحمٰن کے بندے'' زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، کیونکہ ان کا نام رکھا ہے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ''، ''رحمٰن کے بندے'' اور رحمٰن کا بندہ ہونے کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو یہ سمجھے کہ میں اللہ جل شانہ کا بندہ ہوں تو کبھی اس کے دل میں تکبر نہیں پیدا ہونا چاہئے۔ عجب نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ میں بہت اعلیٰ درجے کا آدمی ہوں۔ لہٰذا ''بندگی'' کا سب سے پہلا تقاضا ''تواضع'' ہے۔

یہ تواضع نہیں

''تواضع'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ اس کو ذرا

---

(۱) سورۃ الاسراء: آیت (۳۷)

اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے''تواضع'' کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو عام طور پر ہم لوگ اختیار کرتے ہیں کہ جب ہم ذکر کریں گے تو اپنے آپ کو''احقر'' کہیں گے،''ناچیز'' اور''ناکارہ'' کہیں گے۔ اپنے آپ کو''عاجز'' اور''فقیر'' کہیں گے، لیکن یہ سارے الفاظ جو ہم اپنے لئے استعمال کرتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ تواضع نہیں ہیں۔ بلکہ بسا اوقات یہ تواضع کا دکھاوا ہوتا ہے۔ تواضع کی''ریا'' ہوتی ہے تا کہ دوسرا بندہ مجھے تواضع کرنے والا سمجھے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ تواضع کرنے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ حقیقت میں اپنے آپ کو''حقیر'' اور ''ناکارہ'' سمجھتا ہے۔ اگر واقعی وہ اپنے آپ کو حقیر اور ناکارہ سمجھتا ہوتا تو جب اس نے کہا کہ''میں ناچیز ہوں''،''میں ناکارہ ہوں'' دوسرا اس کے جواب میں یہ کہے کہ:''بیشک، آپ واقعی ناکارہ ہیں'' تو اس کے جواب پر اس کو خوش ہونا چاہئے کہ اس نے میری بات کی تائید کردی، لیکن خوش ہونے کے بجائے اس کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اور اس کو یہ جواب پسند آتا ہے یا نہیں؟

حقیقی تواضع یہ ہے

اس سے پتہ چلا کہ''ناکارہ'' اور''ناچیز'' کے جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ رسمی الفاظ ہوتے ہیں، حقیقی تواضع نہیں ہوتی۔ حقیقی تواضع یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو واقعتاً یہ سمجھے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں، میری کوئی حقیقت نہیں، میرا کوئی ذاتی کمال نہیں، میری کوئی ذاتی صفت نہیں، اگر کچھ ہے تو وہ محض اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور''عطا'' ہونے کی وجہ سے وہ جب چاہے اس کو سلب کر لے۔

اپنی صفات پر نظر کرنے سے تکبر پیدا ہوتا ہے

دراصل دل میں کبر، خود پسندی اور بڑائی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنی صفات کے اوپر ناز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دیکھئے! ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات اور کچھ اچھائیاں دی ہیں۔ مثلاً کوئی خوبصورت ہے، اس کا چہرہ بہت اچھا ہے، یہ ایک اچھائی ہے۔ یا ایک آدمی کے پاس دولت ہے۔ دولت اللہ کی ایک نعمت اور اچھائی ہے۔ یا کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کی توفیق عطا فرمائی ہے اور وہ عابد ہے۔ یہ ایک اچھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ یہ تمام صفات بسا اوقات انسان کے دماغ میں یہ بات ڈالتی ہیں کہ تو ان صفات کا حامل ہے، لہٰذا تو بہت اچھا آدمی ہے۔ مثلاً تو عالم ہے، اور تیرا علم بڑا وسیع ہے، عمیق ہے۔ لہٰذا تو بہت اچھا آدمی ہے۔

یہ صفات اللہ تعالیٰ کی عطا ہے

یہ چیز انسان کے اندر ''عجب'' اور ''کبر'' پیدا کرتی ہے، جبکہ ''تواضع'' یہ ہے کہ انسان یہ سوچے کہ بیشک یہ صفات میرے اندر ہیں، لیکن ان صفات کے حصول میں میرا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور جب اس کی عطا ہے تو میں کس بات پر ناز کروں؟ اور کس طرح اپنے آپ کو بہتر سمجھوں؟

عارضی مکان پر تکبر نہیں ہوگا

مثلاً ایک آدمی نے آپ کو بہت شاندار اور عالی شان مکان دے دیا کہ

ایک ہفتہ کے لئے دے دیا کہ ایک ہفتہ کے لئے میرے اس مکان میں قیام کریں۔ وہ مکان تمام سہولتوں سے آراستہ ہے۔ جس وقت تم اس مکان میں رہائش پذیر ہو، کیا اس وقت تمہارے دماغ میں یہ خیال آئے گا کہ میں اس کا مالک ہوں؟ چونکہ میں مالک ہوں، لہٰذا میں بڑا آدمی ہوں۔ آپ کے دماغ میں مالک ہونے کا خیال نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ میں اس مکان کا مالک نہیں ہوں، بلکہ اس شخص کا احسان ہے کہ اس نے ایک ہفتہ کے لئے بطور رہائش کے مجھے دے دیا ہے، میں تو ایک جھونپڑے کا بھی مستحق نہیں تھا، میں تو سفر میں تھا اور میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ میں ہوٹل میں قیام کروں اور نہ میرے پاس کوئی اور ایسی جگہ تھی جہاں اطمینان سے قیام کرتا۔ اس اللہ کے بندے نے مجھے اچھی رہائش کا گھر دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

میرا کوئی کمال نہیں

لیکن اس مکان کی وجہ سے اس کے دل میں کوئی اکڑ پیدا نہیں ہوگی کہ میں اس کا مالک ہوں۔ لہٰذا بندے کے اندر جتنی بھی صفات ہوتی ہیں، مثلاً ایک شخص بہت بڑا عالم ہے اور اس نے علم کے دریا بہادیئے ہیں، اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے اب وہ عالم ناز کرنے لگے کہ میں نے تو اتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ تکبر ہے لیکن اگر وہ عالم یہ سوچے کہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے علم کی بات دوسروں تک پہنچانے کی توفیق دی، چاہے زبانی طور پر، چاہے تحریری طور پر۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔

میں تو اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ہوں اور اگر میں اپنی اصلیت پر غور کروں تو وہ یہ ہے کہ گندے پانی سے میری پیدائش ہوئی اور میں اس حالت میں دنیا میں آیا کہ نہ میرے بدن پر کوئی کپڑا تھا اور نہ میرے اندر کوئی صلاحیت تھی، پرورش کے لئے بھی دوسروں کا محتاج تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پرورش کردی۔ ماں باپ کو پرورش کا ذریعہ بنادیا۔ پھر میرے پاس علم بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے استادوں کو علم کا ذریعہ بنادیا، ان کے ذریعہ مجھے کچھ علم حاصل ہوگیا۔

سب کچھ اللہ کا دیا ہے

لہٰذا جو کچھ ''علم'' مجھے ملا ہوا ہے وہ میرا ذاتی کمال نہیں بلکہ وہ محض اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور وہ جب چاہے چھین لے۔ اس طرح دولت ہو، عزت ہو، شہرت ہو، علم ہو، عبادت ہو، کچھ بھی ہو وہ سب اللہ جل شانہ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ چاہے تو دے دے، چاہے تو چھین لے۔ لہٰذا ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ کسی کا دیا ہوا ہے، میرا اپنا نہیں ہے اور جب میرا اپنا نہیں ہے تو میں کس بات پر ناز کروں؟ یہ ہے ''تواضع'' اور جب بندہ کسی ولی کی صحبت میں رہتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل میں یہ باتیں آتی ہیں، اس کے بغیر وہ اکڑتا پھرتا ہے۔ کبھی اپنے علم پر ناز ہے، کبھی اپنی قدرت بیان پر ناز ہے، کبھی اپنے حسن پر ناز ہے، کبھی اپنی صحت پر ناز ہے۔ ارے! تمہارے پاس کیا ہے؟ اور کیا تم ان چیزوں کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے پر قادر ہو؟ نہیں!

شیخ الہند کا واقعہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ درس کے اندر بڑی

عالمانہ اور عارفانہ تقریر کی، ایسی تقریر کہ جتنے سامعین تھے، ان کے دلوں پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی کہ ایسی ایسی باتیں سنیں، اور علمی نکتے، معرفت کے نکتے بیان فرمائے۔ جب بیان ختم ہوا تو لوگوں نے آپ کی تعریف کی کہ آج تو آپ نے حقائق اور معارف کے سمندر بہا دیئے۔ حضرت کو بھی احساس ہوا کہ یہ لوگ اس سے خوش ہو رہے ہیں۔ اس کمرے میں ایک روشن دان تھا، جس سے روشنی اور دھوپ آ رہی تھی۔ حضرت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ روشن دان سے جو روشنی اور دھوپ آ رہی ہے یہ روشن دان کا کمال ہے کہ اس نے نور اور روشنی پیدا کر دی؟ ظاہر ہے کہ اس میں روشن دان کا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو سورج کا ہے جو اپنی روشنی پھینک رہا ہے۔ البتہ یہ روشن دان اس روشنی کا ذریعہ بن گیا اور وہ روشن دان تو بے جان ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورج کی روشنی ہم تک پہنچانے کا ذریعہ بنا دیا۔

میری مثال ''روشن دان'' جیسی ہے

اسی طرح میں نے کچھ بھی بیان کیا، اس بیان میں میری حیثیت اس روشن دان کی سی ہے۔ جیسے یہ روشن دان اپنی ذات میں کچھ نہیں۔ اگر اس روشن دان کا دروازہ بند کر دو تو پھر کمرے میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، لیکن سورج نے جب اپنی روشنی روشن دان پر پھینکی تو روشن دان نے اس روشنی کو آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ میری مثال اس روشن دان جیسی ہے، لہٰذا کبھی یہ مت سمجھنا کہ میں نے کوئی بہت بڑا تیر مار دیا ہے اور اتنی اچھی تقریر کر دی ہے۔ دینے والا کوئی اور ہے وہی قلب پر وارد فرماتا ہے۔ بندہ کا کوئی کمال نہیں۔

ملازم، غلام اور بندہ میں فرق

جب بندہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں ''رحمٰن'' کا بندہ ہوں اور بندہ سے زیادہ نچلی چیز کوئی اور نہیں ہوتی۔ ایک ''ملازم'' ہوتا ہے جو خاص وقت کے لئے اور خاص کام کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہوتا ہے اور ایک ''غلام'' ہوتا ہے جو اپنے آقا کے حکم کے تابع ہوتا ہے، جس کام کا آقا نے حکم دیا وہ کام اس کو کرنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آقا کی بندگی اور عبادت نہیں کرتا۔ وہ اس آقا کو اپنا خالق اور اپنا رازق نہیں سمجھتا۔ ''بندہ'' وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کا پیدا کیا ہوا ہوں، وہی میرا خالق ہے، وہی میرا مالک ہے، وہی میرا رازق ہے مجھے علم دینے والا بھی وہی ہے، مجھے دولت دینے والا بھی وہی ہے، صحت دینے والا بھی وہی ہے، حسن دینے والا بھی وہی ہے، لوگوں میں میری عزت کرانے والا بھی وہی ہے، میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردوں گا، اس کے آگے سجدہ ریز ہوں گا، لہٰذا ''بندگی'' سب سے نچلا درجہ ہے۔

''بندہ'' کبھی کسی عمل پر ناز نہیں کرتا

لہٰذا جب بندہ اپنے آپ کو بندہ سمجھے گا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، تو کسی کے سامنے کیا غصہ کرے گا؟ کسی کے سامنے کیا ناز کرے گا؟ کیا وہ اپنے علم پر، اپنی صحت پر، اپنی قدرت پر ناز کرے گا، بلکہ وہ یہ سوچے گا کہ جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے، وہ دکھا بھی دیتا ہے، بڑے سے بڑا علامہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نہ ہوتو وہ گمراہی کے راستے پر پڑجاتا ہے۔

''تواضع'' کا حاصل

بہر حال ''تواضع'' کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بندہ سمجھے اور جو بھی صفت اس کے اندر پیدا ہوئی ہے، اس کو اپنی صفت اور اپنا کمال نہ سمجھے، بلکہ دینے والے کی عطا سمجھے۔ یہ ہے ''تواضع'' جب آدمی اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ میں تو خالی ہاتھ ہوں، اگر مجھے نماز کی توفیق ہو رہی ہے تو یہ بھی میرے مالک کی دی ہوئی توفیق ہے۔ اگر مجھے اچھی بات کہنے کی توفیق ہو رہی ہے تو یہ بھی میرے مالک کا کرم ہے۔ مجھے اگر دولت مل گئی ہے تو یہ بھی میرے مالک کا کرم ہے۔ جب انسان کے دل میں یہ ''تصور'' جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کا نام ''تواضع'' ہے۔

مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو

اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ ''تواضع'' اپنے آپ کو ''حقیر'' سمجھنے کا نام ہے۔ ''حقیر'' کہنے کا نام ''تواضع'' نہیں۔ اور حقیر کس کے سامنے؟ اللہ جل جلالہ کے سامنے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حقیر ہے تو اللہ کی مخلوق کے سامنے بھی وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر نہیں کرے گا کہ دوسروں کی تحقیر کرے۔

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللهِ مَنْ اَحْسَنَ
اِلٰى عِيَالِهٖ (۱)

---

(۱) مسند البزار ۱۳/ ۳۳۲ (۶۹۴۷) ومسند أبي يعلى ۶/ ۶۵ (۳۳۱۵) كلاهما من حديث أنس بن مالك رضى الله عنه، وقال الهيثمى فى "المجمع" ۸/ ۳۴۹ (۱۳۷۰۶)=

کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے، لہٰذا مخلوق کے ساتھ اس کا برتاؤ اس طرح کا نہیں کہ جس سے دوسرے کا دل دکھے۔ یا جس سے دوسرے کی تحقیر اور تذلیل ہو۔ بلکہ اس کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ عاجزانہ ہوگا۔ اس کا نام ''تواضع'' ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادے۔ آمین

تمہاری حقیقت تو یہ ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کا دوسرے کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تو اس نے کہا کہ ''تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟'' یہ جملہ اس شخص کے منہ سے نکلتا ہے جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جانتے نہیں کہ میرا مرتبہ کیا ہے؟ اور میں کتنا بڑا آدمی ہوں؟ تم میرے سامنے حقیر آدمی ہو اور میرے ساتھ جھگڑ رہے ہو؟ دوسرے شخص نے اس کا جواب دیا کہ: ہاں! جانتا ہوں کہ تم کون ہو؟

أوّلك نطفة مذرة و آخرك جيفة قذرة و أنت بين
ذالك تحمل العذرة (۱)

تمہاری ابتداء ایک ناپاک اور حقیر نطفہ سے ہوئی تھی اور تمہاری انتہاء ایک

= وفيه يوسف بن عطيه الصفار، وهو متروك، وشعب الإيمان للبيهقي ٩/ ٥٢٣ (٧٠٤٩) من حديث عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، قال البيهقي: ضعيف. وزهر الفردوس ٤/ ٤٣١ (١٥١٣) من حديث أبي هريرة رضي الله عنه، ورواه عبد الله بن أحمد فى زوائد الزهد عن الحسن مرسلاً كما فى جمع الجوامع للسيوطى ١/ ١٦٩ (٦١٩) وذكره المناوى فى "فيض القدير" ١/ ١٧٤ (١٧٢)، وقال بإسناد ضعيف.

(١) تنبيه الغافلين ص ١٨٥، أدب الدنيا والدين للماوردى ص ٢٣٦

مردار جسم پر ہوگی۔ جس کو لوگ اپنے پاس رکھنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ جب مر جائیں گے تو لاش کو کوئی بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرے گا، بدبو پھیلے گی، جلدی سے جا کر قبر میں دفن کردیں گے اور درمیان کے عرصہ میں تم ہر وقت نجاست اٹھائے پھر رہے ہو۔

جسم نجاستوں سے بھرا ہوا ہے

اللہ تعالیٰ نے اس کھال کو ہماری نجاستوں کا پردہ بنا رکھا ہے۔ ذرا سی کھال کسی جگہ سے چیر دو تو اندر سے خون نکلے گا، پیپ نکلے گی، دونوں نجس ہیں اور تمہارا پیٹ نجاست سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس کھال پر پردہ ڈال دیا ہے، جس کی وجہ وہ سب نجاستیں چھپی ہوئی ہیں ورنہ پورا جسم نجاست ہی نجاست ہے، لہٰذا تم جو کہہ رہے ہو کہ ''جانتے نہیں میں کون ہوں؟'' ہاں میں جانتا ہوں، تمہاری حقیقت یہ ہے، تو انسان کی حقیقت یہی ہے۔

بیت الخلاء کی حالت کو سوچ لیا کرو

ایک آدمی لوگوں کے سامنے بڑا اکڑتا پھرتا ہے اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ وہ آدمی چاہے بادشاہ ہو، سرمایہ دار ہو، دولتمند ہو، جب کبھی کسی آدمی کو اپنی برائی کا خیال آئے تو ذرا یہ سوچ لیا کرے کہ جب میں بیت الخلاء میں بیٹھتا ہوں تو وہاں میری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کوئی آدمی یہ چاہے گا کہ دوسرا آدمی مجھے اس حالت میں

دیکھے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے جسم سے نجاست نکل رہی ہے ؟ ایسی نجاست جو بدبو سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن باہر نکل کر دوسروں کے سامنے اکڑتا پھرتا ہے۔ ارے تو وہی ہے جو چند لمحات پہلے بیت الخلاء میں اس حالت میں تھا کہ تو اس حالت میں دوسروں کا دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اب کوٹ پتلون پہن کر اور ٹائی لگا کر اور اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہن کر باہر نکل آیا اور اب اکڑتا پھرتا ہے کہ میں یہ ہوں میں وہ ہوں۔

''خودرائی'' تواضع کے خلاف ہے

بہرحال: ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی سب سے پہلی صفت ''تواضع'' ہونی چاہئے۔ اب ایک آدمی اپنے آپ کو بڑا دانشمند سمجھتا ہے کہ میں بڑا عقلمند انسان ہوں اور اس کو اپنی رائے پر اتنا جزم ہوتا ہے اور ''خودرائی'' میں مبتلا ہوتا ہے کہ جو میں نے سمجھا، بس وہی ٹھیک ہے۔ دوسری ساری دنیا سب بیوقوف ہے اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے، ساری دنیا غلط ہے، میں صحیح ہوں۔ یہ بات دل میں کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اس لئے پیدا ہو رہی ہے کہ وہ آدمی اپنے رائے کو، اپنی عقل کو، اپنی سمجھ کو اپنا سمجھتا ہے اور اپنی سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کی رائے کو حقیر سمجھتا ہے، حقیر جانتا ہے۔ اگر کوئی اس کے سامنے بولے تو وہ اس کا مذاق اڑا دے گا کہ تو ہمارے سامنے بول رہا ہے؟ تو ہمارے مقابلے میں اپنی رائے پیش کر رہا ہے؟ یہ ''خودرائی'' ہے جو بڑی زبردست بیماری ہے۔ یعنی ہر حالت میں اپنی رائے پر اتنا بھروسہ ہو جائے کہ دوسرے کی رائے سننے کو تیار ہی نہ ہو، بس جو میں نے سمجھا، وہ صحیح ہے، یہ ''تکبر'' ہے۔

ہر کام مشورے سے انجام دو

جو آدمی ''تواضع'' کا حامل ہوگا وہ کبھی دوسرے کے مشورے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔اسی لئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے یہ نصیحت فرمائی کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ''ضابطے کے بڑے'' اس لئے فرمایا کہ حقیقت میں بڑا کون ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ضابطہ میں باپ بڑا ہوتا ہے، بیٹا چھوٹا ہوتا ہے، استاد بڑا ہوتا ہے، شاگرد چھوٹا ہوتا ہے، شیخ بڑا ہوتا ہے، مرید چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ سب ضابطے کے بڑے ہیں۔ حقیقت میں بڑا کون ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مرید شیخ سے آگے نکل جائے، شاگرد استاد سے آگے نکل جائے، بیٹا باپ سے کہیں آگے نکل جائے۔ لیکن ضابطے میں یہ سب بڑے کہلاتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے اپنے اہم معاملات میں مشورہ کرنے کا اہتمام کرو اور ان کے مشوروں کی بنیاد پر فیصلے کرو۔خودرائی سے نہ چلو، اور جب ضابطے کے بڑے ختم ہوجائیں تو پھر اپنے ہم رتبہ جو لوگ ہوں، ان سے مشورے کرو۔ مثلاً ایک استاذ کے دو شاگرد ہیں، وہ دونوں آپس میں ہم رتبہ ہیں، اگر استاذ نہ رہے تو ان شاگردوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے سے مشورہ کرے۔

چھوٹوں سے بھی مشورہ کرو

اور جب برابر کے لوگ بھی نہ رہیں، یا میسر نہ ہوں تو پھر اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ کرو۔ اس وجہ سے تاکہ تمہارے دماغ میں یہ بات نہ آئے کہ میں

چونکہ بڑا ہوں، لہٰذا میری رائے ہمیشہ درست ہی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ چھوٹا کوئی اچھی رائے دے دے اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ڈال دے۔ اچھی رائے آنا، یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے کی بات بھی کارآمد ہوجاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں موجود ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہاں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کہاں؟ وہ پیغمبر ہیں، ان پر وحی نازل ہو رہی ہے اور ان کا ہر وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہے، لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرما رہے ہیں کہ یہ صورتِ حال پیش آگئی ہے، بتاؤ! کیا کرنا چاہئے؟ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع بلا کر ان سے مشورہ ہیں کہ بتاؤ کیا کرنا چاہئے؟

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رائے چھوڑ دی

بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مشورے پر اپنی رائے بھی چھوڑ دی۔ ''غزوۂ احد'' کے موقع پر آپ کی رائے یہ تھی کہ باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ نہ کیا جائے، بلکہ مدینہ میں محصور رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت جوشِ جہاد سے معمور تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم باہر نکل کر مقابلہ کریں گے۔ آپ نے اپنی رائے چھوڑ دی اور ان کی رائے پر عمل کیا ہے۔[1]

(۱) المغازی للواقدی ۱ / ۲۰۹

حضرت مفتیٔ اعظم کا طرزِ عمل

لہٰذا ''تکبر'' اور ''عجب'' کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، جو انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہیں اور کسی اللہ والے کی صحبت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ میں آیا اس بیماری کے اندر مبتلا ہوں یا نہیں؟ اور بعض اوقات انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ تواضع سے محروم ہے۔ ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو ساری زندگی دیکھا جو کہ ''مفتیٔ اعظم پاکستان'' کے لقب سے مشہور تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے۔ ساری زندگی ''فتویٰ'' لکھنے میں گزار دی، لیکن جب کوئی نیا مسئلہ آتا اور جس پر غور کرنا ہوتا تو آپ سب مفتیانِ کرام کو جمع کرتے اور ہم تو ''طفلِ مکتب'' تھے، بچے تھے، لیکن اگر ہمارے دماغ میں کوئی بات آتی تو وہ اس کو اس طرح سنتے تھے کہ کوئی چھوٹا بڑے کو سنتا ہو کہ بھائی دیکھو! ہوسکتا ہے کہ یہ بات صحیح کہہ رہا ہو۔

''خودرائی'' بہت بڑا فتنہ

بہرحال! ''خودرائی'' بہت بڑا فتنہ ہے۔ دنیا میں جتنے بھی اصحابِ صفات ہیں یعنی جن کو کوئی خاص صفت حاصل ہے، چاہے وہ ''عالم'' ہو، چاہے وہ ''دولتمند'' ہو، چاہے وہ ''صحتمند'' ہو، چاہے وہ ''قوی'' ہو، چاہے وہ ''ہنرمند'' ہو۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیتا ہے تو زبردست آدمی ہے اور تیرا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ تیری رائے جو ہوگی وہ رائے اعلیٰ ہوگی اور باقی سب لوگ بے وقوف ہیں یا کم از کم وہ غلط رائے پر ہیں۔ جب دماغ میں یہ بات آگئی تو سمجھ لو کہ ''تکبر'' پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اس کا علاج شروع کرو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کا سب سے پہلا وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ جب انسان کے اندر تواضع ہوتی ہے تو پھر انسان کی نقل وحرکت پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب انسان اندر سے یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی ذات میں کچھ نہیں ہوں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے تو اس کا مظاہرہ اس کی نقل وحرکت پر بھی ہوگا۔ پھر وہ اکڑ کر چل نہیں سکتا۔ کس بات پر اکڑے؟ بلکہ جب وہ چلے گا تو عاجزی سے چلے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ صفت عطا فرما دے اور ہم رحمٰن کے بندے بن جائیں۔ شیطان کے بندے نہ بنیں۔ اپنے نفس کے بندے نہ بنیں۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۶

”عباد الرحمٰن“ تیسرا حصہ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دُعَا

دعا نمبر ۲۶ ''عباد الرحمٰن'' تیسرا حصہ

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ دو ہفتوں سے ان دعاؤں کا ذکر چل رہا ہے، جن کو قرآنِ کریم میں ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی طرف منسوب فرمائی گئی ہیں کہ ''رحمٰن'' کے بندے کیا دعا کرتے ہیں؟ ان دعاؤں سے پہلے جو صفات ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی بیان کی گئی ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان صفات کے بارے میں بھی کچھ بات کی جائے۔ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ یہ ہے:

الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا

کہ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' وہ لوگ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

اس سے ان کی ایک باطنی صفت کی طرف اشارہ ہے، وہ ہے ''تواضع'' لہٰذا رحمٰن کے بندے ہونے کا پہلا تقاضا یہ ہوا کہ انسان میں ''تواضع'' ہو اور ''تواضع'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ ''وہ اپنے آپ کو کسی سے بھی افضل نہ سمجھے'' کسی صفت میں انسان کا اپنے آپ کو دوسرے سے ''کامل'' سمجھنا یا ''اکمل'' سمجھنا تواضع کے منافی نہیں، لیکن اپنے کو دوسرے سے ''افضل'' سمجھنا ''تواضع'' کے منافی ہے۔ لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ کی ''بندگی'' کا پہلا تقاضا یہ بیان کرنا کہ ان کے اندر ''تواضع'' ہوتی ہے۔

''سلامًا'' کے دو معنیٰ

اس کے بعد ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا(۱)

جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ خود تو لڑنے جھگڑنے والے نہیں ہوتے بلکہ جب دوسرے جھگڑے والے ان سے مخاطب بھی ہوتے ہیں تو ان کا جواب لڑ جھگڑ کر نہیں دیتے، بلکہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ بیان میں عرض کیا تھا کہ ''سلاماً'' کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ وہ ''سلام'' کہتے ہیں کہ ''میرا الوداعی سلام'' ہمارا راستہ اور ہے اور آپ کا راستہ اور ہے۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ جب وہ دوسرے کو جواب دیتے ہیں تو ''سلامتی والا جواب'' دیتے ہیں۔ مزید لڑائی جھگڑے کی بات نہیں کرتے کہ تم نے مجھ سے یہ کہا اس کا جواب یہ دیتا ہوں، تم

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۳)

نے مجھ سے یہ کہا، اس کا جواب یہ دیتا ہوں۔ یعنی جو لوگ ناشائستہ گفتگو کر رہے ہیں، انہی کی سطح پر آ کر میں بھی ان کا جواب دینا شروع کر دوں۔

گالی کا جواب گالی سے دینا

مثلاً اس نے کہا کہ ''تم جاہل آدمی ہو'' تم نے جواب میں کہا کہ تو جاہل، تیرا باپ جاہل، تیرا دادا جاہل، میں یہ نہیں کرتا بلکہ میں تو سلامتی کی بات کہوں گا وہ اگر گالی بھی دے رہا ہو وہ اگر میرے اوپر بہتان اور الزام بھی لگا رہا ہو۔ لیکن میں صرف سلامتی کی بات کروں گا اور جواباً اس پر کوئی چلتا ہوا الزام نہیں ڈالوں گا جو بغیر دلیل ہو اور نہ میں اس کی گالی کا جواب گالی سے دوں گا، بلکہ سلامتی کی بات کہوں گا۔ یہ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کا ایک وصف ہے۔

اختلاف کی صورت میں ہمارا طرزِ عمل

آج کل ہم لوگوں کو ان باتوں کا استحضار کرنے کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ماحول میں ''مخالفت'' دشمنی کا نام ہے۔ ''اختلاف'' دشمنی کا نام ہے۔ جس کسی سے ''اختلاف'' ہوگیا تو اب اس کی جان، مال، عزت، آبرو، سب حلال ہوگئیں جو لوگ تھوڑی بہت احتیاط کرنے والے ہیں، وہ شاید ''جان'' پر تو حملہ نہ کریں ''مال'' پر حملہ نہ کریں، لیکن آبرو تو بالکل حلال ہے۔ یعنی جس شخص سے ''رائے'' کا اختلاف ہے، ''مسلک'' کا اختلاف ہے تو اس کی ''آبرو'' حلال ہے، اس کو جو چاہو، کہہ دو۔ جو بات چاہو بغیر تحقیق کے اس کی طرف منسوب کر دو کہ وہ تو یہ کہتا ہے، وہ تو یہ کہتا ہے اور اگر کہیں اس نے ہمارے اوپر زبانی حملہ

کردیا تو پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس کے زبانی حملہ کا جواب ایسا دیا جائے گا کہ وہ منہ چاٹتا رہ جائے گا، اور آج اسی کو بہت بڑا وصف قرار دیا جاتا ہے کہ "میں نے اس کو دندان شکن جواب دے دیا"، "میں نے اس کو لاجواب کردیا"، "میں نے اس کی حقیقت اس کے اوپر واضح کردی"، "میں نے اس کو۔۔۔۔بنادیا"۔

آج کل "اختلاف" کے معنیٰ "لڑائی"

اور ان کے جو مریدین اور معتقدین ہوتے ہیں، وہ اور آگے بڑھ کر کیا سے کیا بنادیتے ہیں، اور اس قسم کے جملے اپنے مخالفین کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ عام مزاج بنتا جارہا ہے۔ چاہے مذہب اور دین ہو، چاہے سیاست ہو، یا کوئی اور شعبۂ زندگی ہو، آج کل "اختلاف" کے معنیٰ ہیں "لڑائی"۔ لڑائی بھی نچلی سطح کی لڑائی، شریفانہ لڑائی نہیں، بلکہ "رذالت" والی لڑائی "اختلاف" کے نتیجے میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا، ایک دوسرے پر الزام عائد کرنا، اور تحقیق کے بغیر کسی کی طرف برائیاں منسوب کردینا۔

یہ بھی حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب یہ خرابی صرف سیاسی لوگوں میں ہی نہیں، بلکہ خود ہمارے اہلِ علم، اہلِ دین کے طبقے میں بھی آچکی ہے اور آدمی جتنا زیادہ چرب زبان ہوتا ہے، اور جتنا وہ دوسرے کی پگڑی اچھالنے والا ہو، اتنا ہی اس کو محبوب اور معقول قرار دیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ہدایات اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کی سنت اور انبیاء علیہم السلام کا طریقہ اب صرف چند ظواہر کے اندر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ مثلاً ہمارا لباس ایسا ہے، ہمارا حلیہ ایسا ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں ۔الحمد للہ۔ یقیناً یہ صفات قابلِ قدر ہیں اور یقیناً یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا تقاضا ہے۔ لیکن سنت صرف ان اعمال میں منحصر نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ بھی ہے کہ کبھی گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا۔ آپ کی سنت یہ بھی ہے کہ لوگوں سے بشاشت کے ساتھ معاملہ فرمایا۔ آپ کی سنت یہ بھی ہے کہ چند مواقع کے علاوہ مخالفین کے لئے کبھی بددعا نہیں فرمائی، آپ کی سنت یہ بھی ہے کہ کبھی کسی کے لئے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جو دل آزاری پر مشتمل ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

آپ کی سنت یہ ہے کہ

مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً اَحَبَّهُ[1]

اگر کوئی شخص اچانک آپ کو دیکھ لیتا تو اس پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی۔ لیکن جب کوئی شخص آپ کے ساتھ بشاشت کے ساتھ رہتا تو وہ رعب محبت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تجربہ ہے جو انہوں نے بیان فرمایا۔ یہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتیں ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ''حلم'' دیکھئے کہ کس طرح بردباری سے لوگوں کے ساتھ معاملہ فرمایا۔ کس طرح آپ

---

(۱) سنن الترمذی ٦ / ٢٧ (٣٦٣٨) وقال هذا حديث ليس اسناده بمتصل وشعب الايمان للبيهقی ٣ / ١٣ (١٣٥٠)

نے اپنے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کردیا کہ:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ(۱)

آج یہ سنتیں کہاں چلی گئیں

یہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہیں۔ آج یہ سنتیں کہاں چلی گئیں؟ اور صرف ظواہر کی سنتیں کیوں باقی رہ گئیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج باطنی تربیت نہیں۔ باطن میں تکبر کے اور حسد کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ کیوں مجھ سے آگے بڑھ گیا؟ اگر کسی کی معمولی سی غلطی سامنے آگئی تو وہ ایک پہاڑ بنا کر اس کو آسمان پر چڑھا دیا گیا۔ اب اس کے لئے طنز، تعریض، استہزاء، سب حلال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ یہ ایک بڑی خطرناک وبا ہے جو پھیلی ہوئی ہے اور ''اختلاف'' کو اختلاف کی حدود میں رکھنے کا معاملہ کہیں دور چلا گیا۔

اس بیماری کی اصل ''حبِ جاہ'' اور ''تکبر'' ہے

اللہ تعالیٰ کسی غلط بات کو دل میں بٹھانے سے مجھے معاف فرمائے۔ آمین۔ لیکن بظاہر بزرگوں سے جو سنا اور ان سے جو سمجھا، وہ یہ کہ اس چیز کا اصل مبنیٰ دو چیزیں ہیں۔ ایک حُبِ جاہ اور دوسری تکبر۔ ''حبِ جاہ'' کا مطلب ''لوگوں میں مقبولیت'' کا شوق ہوجانا کہ دنیا کے اندر لوگوں میں میری مقبولیت ہو، لوگ میری

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقی ۹/ ۱۹۹ (۱۸۲۷۵ و ۱۸۲۷۶)

اچھائیوں کے گن گائے۔ لوگ مجھے اچھا سمجھیں، لوگ میری تعریف کریں۔ اب اگر کسی اور کی تعریف ہو رہی ہے، جبکہ خواہش تو تھی کہ میری تعریف ہو تو یہ چیز انسان کے دل میں ''حسد'' پیدا کر دیتی ہے اور جب دل میں ''حسد'' آجاتا ہے تو پھر یہ ''تکبر''، ''حسد'' اور ''حبِ جاہ'' یہ سب چیزیں مل کر انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ میں دوسرے کی مٹی پلید کروں۔ پھر اس کے نتیجے میں ''سخت کلامی''، ''استہزاء''، ''بدگمانی''، ''تجسس''، ''غیبت'' یہ سب برائیاں آجائیں گی۔ پھر اس کا نتیجہ ''بدکلامی'' میں نکلے گا۔ تو یہ جو ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کا وصف تھا کہ

اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

اس سے ہم کتنا دور چلے گئے؟

اپنے اندر ''حلم'' پیدا کریں

بہر حال! یہ ایک بیماری ہے، جس میں ہم سب مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔ اس بات کو بہت پھیلانے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اندر ''حلم'' پیدا کریں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِىْ بِالْعِلْمِ وَزَيِّنِّىْ بِالْحِلْمِ [1]

اے اللہ! علم کے ذریعہ غنی بنا اور حلم کے ذریعہ زینت عطا فرما۔

''حلم'' کے معنیٰ ہیں ''بردباری'' یہ نہیں کہ آدمی فوراً غصہ میں آجائے۔ بلکہ

---

(۱) الأمالی الخمیسیة للشجری ۱ / ٤٨، الحلم لابن أبی الدنیا ص ۲۰

''بردباری'' ہو۔ علم کی زینت ''حلم'' سے ہوتی ہے اس ''حلم'' کی سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، جس کے خلاف عملی مہم چلی ہوئی ہے۔ جس نے ہمارے ماحول کو بھی گندہ کیا ہے اور ہمارے درمیان فرقہ بندی اور گروہ بندی کو فروغ دیا ہوا ہے۔

اکابرِ علماءِ دیوبند نے اسی پر عمل کر کے دکھایا

ہمارے اکابر حضرات علماء دیوبند، جن کے ہم نام لیوا ہیں، انہوں نے اس سنت پر جس طرح عمل کر کے دکھایا اور اس کے جو نتائج سامنے آئے، ان کو کبھی کبھی پڑھنا چاہئے اور ان کے حالات کو جاننا چاہئے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کو ایک جگہ وعظ کہنے کے لئے بلایا گیا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور جس جگہ وعظ کے لئے بلایا گیا تھا وہ سارا علاقہ وہ تھا جہاں کے لوگ آپ کے بارے میں محض غلط فہمی کی بنیاد پر سمجھتے تھے کہ آپ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے اور وہ لوگ ان چیزوں کے قائل تھے جو حضرت تھانوی کے مسلک میں مناسب نہیں تھیں، یا جائز نہیں تھیں۔ مثلاً میلاد، قیام وغیرہ

حضرت تھانوی کا سبق آموز واقعہ

جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ کے لئے وہاں تشریف لائے تو کسی نے حضرت کے پاس ایک پرچہ بھیجا، اس پرچہ میں یہ لکھا تھا کہ:

''مولانا: ہم نے سنا ہے کہ آپ کافر ہیں؟ دوسرا یہ کہ ہم نے سنا ہے کہ

آپ ''جولا ہے'' ہیں؟ جو لوگ کپڑا بنتے ہیں، انہیں ''جولاہا'' کہا جاتا تھا اور جولاہے کو ایک کمتر پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ تیسرا یہ کہ اگر آپ نے وعظ میں کوئی اختلافی بات بیان کی تو ہم برداشت نہیں کریں گے۔''

آپ اندازہ لگائیں کہ پہلے نمبر پر آپ پر کافر کا حکم لگا دیا، دوسرے نمبر پر ''نسب'' میں طعن کیا اور تیسرا یہ کہ اگر اختلافی بات کی تو ہم برداشت نہیں کریں گے۔ مطلب یہ تھا کہ حسبِ معمول اپنا کردار ادا کریں گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

''میرے پاس یہ ایک پرچہ آیا ہے، میں وعظ سے پہلے اس پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پرچہ میں پہلی بات یہ کہی کہ ''میں کافر ہوں'' میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ پہلے میں کافر تھا، یا نہیں تھا، میں آپ سب حضرات کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں ''اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمّدا رسول الله'' یہ وہ کلمہ ہے ستر برس کا کافر بھی اس کے پڑھنے سے مسلمان ہوجاتا ہے۔ میں نے آج آپ کے سامنے یہ کلمہ پڑھ لیا۔ اب تو میں مسلمان ہوگیا؟

(۲) دوسری بات اس پرچہ میں یہ کہی ہے کہ ''آپ جولا ہے ہیں'' نسب کے اعتبار سے؟ تو بھائی میں یہاں کوئی رشتہ لے کر تو نہیں آیا ہوں کہ میرے نسب کی تحقیق کی ضرورت ہو؟ اگر میں جولاہا بھی ہوں اگر صحیح بات کہوں تو اس کے قبول کرنے میں کوئی مانع نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا اس بحث میں پڑنا بھی فضول ہے کہ میں جولاہا ہوں یا نہیں؟

(۳) تیسری بات اس پرچے میں یہ کہی ہے کہ "اختلافی مسائل نہ بیان کرنا" پہلی بات یہ ہے کہ میں یہاں خود سے نہیں آیا ہوں بلکہ کسی کی دعوت پر وعظ کہنے کے لئے آیا ہوں، اگر آپ میرا وعظ سننا نہیں چاہتے تو آپ میں سے ایک آدمی بھی کھڑا ہو کر کہہ دے کہ ہم آپ کا وعظ نہیں سننا چاہتے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ میں وعظ کروںؔ تو یہ قید برداشت نہیں کروں گا کہ اختلافی مسائل نہ بیان کئے جائیں۔ اگرچہ میری عادت اختلافی مسائل بیان کرنے کی نہیں ہے بلکہ دین کی مثبت باتیں بیان کیا کرتا ہوں۔ لیکن اثناءِ کلام کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا ہے تو پھر چھوڑتا بھی نہیں ہوں۔ میری یہ باتیں اگر آپ حضرات کو قبول ہیں تو میں وعظ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر ایک آدمی کھڑے ہو کر یہ کہہ دے کہ ہمیں منظور نہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

آج سب اشکالات آپ نے ختم کر دیئے

جب یہ جواب دیا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا، بلکہ کسی نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضرت! آپ سے کسی نے بھی یہ کہہ دیا ہو لیکن آپ وعظ فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت والا نے بیان فرمایا اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ سارے اختلافی مسائل جو اس علاقے میں رائج تھے۔ تقریباً ان سب پر بیان ہوا، لیکن بیان اس طرح ہوا کہ اس میں کسی پر طعن و تشنیع نہیں تھی۔ اس میں کسی کی دل آزاری نہیں تھی، اس میں کسی کی توہین اور تذلیل کے الفاظ نہیں تھے۔ بس مسئلہ کی حقیقت بیان فرمادی۔ جب وعظ ختم ہوا تو وہ صاحب جنہوں نے "پرچہ" بھیجا تھا، وہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ:

''وہ پرچہ میں نے بھیجا تھا اور میرے ذہن میں جو کچھ بھی آپ کے بارے میں اشکالات تھے، آج وہ آپ نے سب ختم کردیئے۔''

جواب دینے کا دوسرا طریقہ بھی تھا

یہ درحقیقت اسی آیت ''اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' پر عمل تھا۔ اگر حضرت والا اس کے جواب میں یہ کہتے کہ جس شخص نے یہ پرچہ بھیجا ہے وہ مجھ سے بڑا کافر ہے، بلکہ ''اکفر'' ہے اور جو مجھے ''جولاہا'' کہتا ہے وہ خود ''جولاہا'' اس کا باپ ''جولاہا'' اس کا دادا ''جولاہا''، کون ہے، میدان میں آئے اور مجھے وعظ کہنے سے روکے؟ جواب دینے کا ایک طریقہ یہ تھا۔ لیکن اس طریقہ کا انجام لڑائی تھا اور ہوسکتا تھا کہ وہ لڑائی خونریزی تک پہنچ جاتی۔ لیکن حضرت والا نے جو طریقہ اختیار فرمایا، اس میں سارے معاملات آسانی کے ساتھ طے کر کے لوگوں کی اصلاح کا ایک راستہ نکال دیا۔ یہ ہے اس آیت ''اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' پر عمل۔

حضرت نانوتوی کا سبق آموز واقعہ

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ کسی شخص نے ایک شعر کہا، اور اس شعر میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو کافر کہہ دیا اور آپ پر کفر کا فتویٰ لگادیا۔ حضرت کے ایک مرید جو شاعر تھے، انہوں نے اس شعر کا جواب شعر میں دیا اور بڑا زبردست چبھتا ہوا جواب دیا، فرمایا:

مرا اگر کافر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغ را جزا باشد دروغے

مجھے اگر تم نے کافر کہا ہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا چراغ زیادہ دیر جلا نہیں کرتا۔ اور دوسرے شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ: تم نے مجھے کافر کہا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے ''کافر'' کہہ کر جھوٹ بولا تھا، میں تمہیں ''مسلمان'' کہہ کر جھوٹ بولتا ہوں۔

ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے

جب وہ صاحب یہ شعر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لکھ کر لے گئے کہ حضرت میں نے یہ اس کے جواب میں شعر کہا۔ حضرت والا نے فرمایا کہ تم نے شاعری کے اعتبار سے تو کمال ہی کر دیا۔ لیکن تم نے لپیٹ کر بالکل کافر تو کہہ دیا اور ہم ایسی بات نہیں کرتے، ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے، لہٰذا اس شعر کو بدلو اور یوں کہو:

مرا گر کافر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغ
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دروغے

یعنی میں تمہیں ''کافر'' کہنے کے جواب میں ''مسلمان'' کہوں گا اور تم نے مجھے جو کڑوی چیز دی ہے، میں اس کے مقابلے میں میٹھا کھلاؤں گا۔

اگر تو مؤمن قبہا والا

دروغے را جزا باشد دروغے

یعنی اگر میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں اگر واقعی مسلمان ہو تو اچھی بات ہے، اگر خدا نہ کرے تم مسلمان نہ ہو تو جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح آپ نے اس جواب کو تبدیل کر دیا۔

شاعری کے بگاڑ کو گوارہ کرلیا

''شعر'' ایسی چیز ہے جو قانونی باریکیوں میں نہیں جایا کرتا۔ بلکہ شعر کے اندر ایک لطافت ہوتی ہے، اس لحاظ سے اگر ان اشعار کو دیکھا جائے تو حضرت والا نے جو قانونی قیود وشرائط درمیان میں بڑھائی ہیں، اس سے شعر کا توستیاناس ہوگیا، لیکن شاعری میں بھی کسی کو غلط بات کہنا گوارہ نہیں تھا۔ اس لئے حضرت والا نے شاعری کے بگاڑ کو گوارہ کرلیا۔ لیکن حقیقت بیان کرنے سے نہیں رکے۔ یہ وہی اس آیت پر عمل ہے کہ ''اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا''۔

آپس کے جھگڑے ختم کردو

آج ہم کہاں جارہے ہیں؟ اور آج یہ وصف کس کے اندر ڈھونڈا جائے؟ آج کون ہے جو یہ کہے کہ ''میں جھگڑا نہیں چاہتا'' اگر قرآن وحدیث کے احکام پر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ شریعت نے قدم قدم پر اس بات کا لحاظ رکھا

ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم ہوں۔ دین کو جھگڑوں سے بیر ہے اگر دین ہے تو جھگڑا نہیں ہوگا، یا کم سے کم ہوگا۔ اگر دین ہے اور اتباع سنت ہے تو پھر جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جھگڑا وہاں ہوتا ہے جہاں دونوں جھگڑے والے متکبر ہوں پھر وہ دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوجاتے ہیں، لیکن اگر ان کے دلوں میں ''تکبر'' نہیں ہے، ان کے دلوں میں ''حبِ جاہ'' نہیں ہے ''حسد'' نہیں ہے تو پھر جھگڑا کہاں سے آئے گا؟

جنت کے درمیان گھر کی ضمانت

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم قدم پر جھگڑوں سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے ایک حدیث شریف میں فرمایا:

اَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ اَعْلَى الْجَنَّةِ وَ بِبَيْتٍ فِيْ وَسْطِ الْجَنَّةِ وَ بِبَيْتٍ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَآءَ وَهُوَ مُحِقٌّ (۱)

فرمایا کہ اس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ لیتا ہوں جو شخص حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔ حق پر تھا، اگر جھگڑا کرتا تو شرعاً اس کے لئے جائز تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو جھگڑے سے بچانے کے لئے اپنا حق

---

(۱) سنن أبي داؤد ٥ / ٣٥٥ (٤٧٦٧) و مسند الرویانی ٢ / ٢٧٩ (٢٠٠) والمعجم الكبير للطبراني ٨ / ١٨٦ (٧٧٧٠)، وسنن الترمذي ٣ / ٥٣٠ (١٩٩٣) وقال هذا الحديث حديث حسن.

چھوڑ دیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں ایسے شخص کے لئے جنت میں گھر دلوانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ کیوں؟ اس لئے آپ یہ نہیں چاہتے کہ لوگوں کے درمیان جھگڑا ہو۔

بیت اللہ میں تبدیلی کا ارادہ موقوف کر دیا

''بیت اللہ'' کعبہ شریف، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، آپ نے جن بنیادوں پر تعمیر کیا تھا، قبیلہ قریش نے اس میں کمی کر دی اور چنانچہ ''حطیم'' کی جگہ پہلے بیت اللہ کے اندر داخل تھی۔ قریش نے اس کو نکال دیا اور بیت اللہ کے دو دروازے تھے ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف۔ قریش نے مشرق کے دروازے کو برقرار رکھا اور مغرب والے دروازے کو نکال دیا۔ اس کے علاوہ بیت اللہ کی چھت میں بھی کچھ تصرف کیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں اس بیت اللہ کو از سرِ نو اصل بناءِ ابراہیمی پر تعمیر کر دوں۔ لیکن میں اس لئے نہیں کرتا کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ لوگ تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہیں، اگر کعبہ کو چھیڑا جائے گا تو کہیں ان لوگوں کے اندر ردِ عمل پیدا نہ ہو جائے اور کہیں جھگڑے کا راستہ نہ نکل جائے۔ جھگڑے کی وجہ سے اتنا بڑا اہم کام آپ نے چھوڑ دیا۔ کیوں چھوڑ دیا؟ تاکہ جھگڑا نہ ہو۔ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری ۲ / ۱٤٦ (۱٥۸٤)

مفضی الَی النزاع معاملہ ناجائز ہے

قدم قدم پر شریعت میں آپ کو یہ احکام ملیں گے کہ جھگڑے سے پرہیز کرو۔ فقہاءِ کرام کے ہاں ایک مستقل اصول ہے، وہ ہے "مفضی الی النزاع" یعنی ہر وہ عقد، معاملہ، ٹرانزیکشن، جس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ آگے چل کر فریقین کے درمیان جھگڑا ہو جائے گا۔ ایسا معاملہ ناجائز اور فاسد ہے اور ناقابلِ قبول ہے۔ کیوں؟ تاکہ معاشرے سے جھگڑے ختم ہوجائیں۔ آج ہم لوگ جھگڑوں کو دعوت دیتے ہیں، میرا مدِمقابل میرے سامنے آئے۔

قرآنِ کریم کی اس آیت پر عمل کرو

قرآنِ کریم کی یہ آیات صرف پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں، بلکہ یہ سب آیات عمل کے لئے ہیں۔ اگر آدمی یہ شیوہ اپنا لے کہ جو اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ: "اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا" تو دنیا سے جھگڑوں کا وجود ختم ہوجائے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب آدمی کوئی بات کرتا ہے تو اس کی ایک بنیاد یہ ہوتی ہے کہ میں اپنی نفسانی خواہش کو پورا کروں۔ مثلاً یہ خواہش کہ دل چاہتا ہے کہ میں اس کا منہ نوچ لوں۔ دل چاہ رہا ہے کہ میں اس کو ترکی بہ ترکی جواب دوں۔ یہ "نفسانیت" ہے۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی نفسانیت کی بنیاد پر بات کر رہا ہے تو وہ جھگڑے کی طرف لے جائے گا اور وہ "نفسانیت" اس کو حدود کے اندر نہیں رہنے دے گی، بلکہ حدود سے آگے بڑھا دے گی۔

اللہ کے لئے کام کروگے تو حدود کی پابندی ہوگی

اگر کوئی آدمی جو بات کررہا ہے یا جو کام کررہا ہے وہ ''اللہ'' کے لئے کررہا ہے، اور اس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر قربان کردیا ہے۔ ایسے شخص کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دوسرا مجھے اچھا سمجھے یا برا سمجھے یا دوسرا آدمی میرے لئے اچھے الفاظ استعمال کرے یا برے الفاظ استعمال کرے۔ کرتا رہے مجھے تو اپنے ''اللہ'' کو راضی کرنا ہے۔ مجھے تو اس جھگڑے میں نہیں پڑنا کہ اس نے مجھے کیا کہا تھا اور جب مجھے اپنے ''اللہ'' کو راضی کرنا ہے تو میری زبان اور میرا قلم حدود کی پابند ہوگی۔ ''تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ '' یہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدیں ہیں، ان حدود سے آگے بڑھنا یہ ''نفسانیت'' ہے۔

محبت اور بغض سب اللہ کے لئے ہو

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ پہچان ہمارے اندر پیدا فرمادے کہ ہم کون سی بات ''نفسانیت'' کے تحت کررہے ہیں؟ اور کون سی بات ''اللہ'' کے لئے کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپس کے دوستوں کے درمیان جو بات چیت ہوتی ہے اس میں بھی یہی پیشِ نظر رکھے کہ اگر کسی سے دوستی کرے تو وہ بھی ''اللہ'' کے لئے کرے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ''(۱)

---

(۱) سنن أبي داود ۵/ ۲۸۱ (۴۶۵۲) وأخرجه الذهبي في "معجم الشيوخ" ۲ / ۲۴۷ من طريق أبي داود وقال هذا حديث صحيح.

کہ جس شخص نے ''اللہ'' کے لئے محبت کی اور کسی سے بغض ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔ جب بغض بھی اللہ کے لئے ہے اور وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ فلاں شخص اللہ کی نافرمانی پر تلا ہوا ہے اور یہ فساد پھیلا رہا ہے، اس وجہ سے مجھے اس شخص سے بغض ہے تو جب ''بغض'' اللہ کے لئے ہوگا تو اس شخص کو جواب دیتے وقت ''اللہ'' کے احکامات بھی سامنے ہوں گے، لیکن اگر ''نفسانیت'' کی بنیاد پر بغض ہوگا تو پھر احکامات سامنے نہیں ہوں گے، بلکہ اس وقت میرا جوش اور میرا جذبہ ہوگا اور میرا غصہ ہوگا، اور اس غصہ کے تحت میں سارے کام کروں گا۔

اس آیت کی مخالفت چھوڑ دو

میرے بھائیو! میرے عزیزو! میں اپنا دل کس طرح آپ کے سامنے کھولوں اور کس طرح اس بات کو بیان کروں کہ اس آیتِ کریمہ ''وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' کی مخالفت پر لوگوں نے کمر باندھی ہوئی ہے۔ اور اس کی وجہ سے آج ہمارا پورا معاشرہ لڑائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جھگڑوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کہیں سیاسی جھگڑے، کہیں مذہبی جھگڑے، کہیں معاشرتی جھگڑے، کہیں عصبیاتی جھگڑے، گروہی جھگڑے، یہ سب کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ اس آیت کی مخالفت کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں یہ جو فرمایا گیا کہ جب جاہل لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ اس میں یہ تو بیان کر دیا کہ جاہلوں کو جواب کس طرح دینا چاہئے؟ لیکن اگر کوئی جاہل خطاب نہیں کر رہا۔ اس وقت میں جب بات کروں تو کس طرح کروں؟ اس کا ذکر اس آیت میں براہ راست نہیں ہے۔

خودلڑائی کا آغاز کبھی نہ کرے

لیکن ''دلالت النص'' کے طور پر اس آیت میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ جب دوسرے کی گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا چاہیے تو خود گالی سے ابتداء کرنا کس طرح جائز ہوگا؟ لہٰذا اس میں یہ بات خود پنہاں ہے کہ گالی سے بات کا آغاز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بات کا اس آیت میں ذکر ہی نہیں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خودلڑائی کا آغاز کرے اور آغاز کرکے دوسرے پر حملہ کرے، بلکہ جب دوسرے لوگ اس کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں تو بھی یہ ان کا جواب ''سلامتی'' ہی سے دیتا ہے۔

رائے کا اختلاف کبھی ختم نہیں ہوسکتا

ان سب باتوں کا کوئی شخص یہ مطلب نہ سمجھے کہ اس آیت کے ذریعہ اختلاف سے منع کیا جارہا ہے۔ یادرکھیئے: اختلافِ مسلک ایک حقیقت ہے اور اس کو بالکل مٹانا تقریباً ناممکن ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ سب لوگ ایک رائے پر متفق ہوجائیں، یہ نہیں ہوسکتا اور اس وقت تک یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ سارے لوگ یا تو ''بیوقوف'' ہوجائیں، عقل سے خارج ہوجائیں یا سب کے سب لوگ ''بددیانت'' ہوجائیں کہ ایک نے جو بات کہہ دی کہ سب نے کہا: سبحان اللہ! بالکل درست ہے۔ اپنی عقل استعمال نہیں کررہا ہے۔ اس لئے کہ سب بیوقوف ہیں۔ تب تو اتحاد ہوجائے گا۔ یا سب لوگ ''بددیانت'' ہوجائیں کہ مجھے اس رائے سے اختلاف تو ہے، مگر میں

اپنی رائے کو ظاہر نہیں کرتا یہ ''بددیانتی'' ہے۔ لہٰذا جب تک ''دیانت'' موجود ہے اور ''عقل'' موجود ہے، اختلاف باقی رہے گا۔

''اختلاف کو دشمنی نہ بنایا جائے

لیکن اس اختلاف کو ''اختلاف'' ہی رکھا جائے، اس کو ''دشمنی'' نہ بنایا جائے۔ اس کو ''شقاق'' کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے ''وحدتِ امت'' یعنی کیا یہ اختلاف ہے یا شقاق ہے؟ اس لئے ان باتوں سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ ہم اختلاف رائے سے منع کر رہے ہیں۔ اختلافِ رائے تو ہوجاتا ہے، لیکن اس اختلاف کو ''دشمنی'' کا ذریعہ بنانا اس کو طعن و تشنیع کا ذریعہ بنانا، اس کی بنیاد پر دوسرے کو ذلیل کرنا، کسی بھی انداز سے کرنا اس آیتِ قرآنی کے خلاف ہے۔

اپنی زندگی میں یہ سبق لے لیں

اگر ہم اس آیت کو پڑھتے ہوئے اپنی زندگی کے اندر یہ سبق لے لیں کہ کچھ بھی ہوجائے۔ ہم اپنے آپ کو پرسکون رکھیں گے۔ ہم اپنے آپ کو ''سلامتی کے راستے پر رکھیں گے، کوئی کتنا بڑا دشمن ہمارے سامنے آجائے، اور وہ ہم سے کتنی ہی بدکلامی کرے، ہم اس کے جواب میں بدکلامی نہیں کریں گے، بلکہ اس آیت ''وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' پر عمل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۶

''عباد الرحمٰن'' چوتھا حصہ

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعَا

دعا نمبر ۲۶ ''عباد الرحمٰن'' چوتھا حصہ

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! گزشتہ چند مجلسوں سے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کے دو وصف جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں: اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ان دو صفات پر گزشتہ مجلسوں میں کچھ عرض کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

راتوں میں عبادت کرنے والے

آگے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی تیسری صفت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا [1]

یعنی وہ لوگ راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ کبھی اپنے پروردگار کے لئے سجدے میں ہیں، کبھی اپنے پروردگار کے لئے قیام میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو رات کی عبادت بڑی پسند ہے۔رات کی عبادت اس لئے پسند ہے کہ دن میں تو آدمی کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ مسائل میں الجھا ہوا ہے، اس میں نماز کا وقت آ گیا تو نماز میں کھڑا ہوگیا۔ اب نماز کے اندر ہزار قسم کے خیالات بھی آرہے ہیں اور نماز بھی ہو رہی ہے، لیکن رات کے وقت جب بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت دوسرے خیالات ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ تعلقات سے کنارہ کش ہو کر بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بس وہ ہے اور اس کا اللہ ہے۔ تیسرا کوئی نہیں۔ یہ چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

رات کی عبادت ”اللہ“ کے قرب کا ذریعہ

اور جب بندہ اس طرح رات کے وقت کھڑا ہوتا ہے، رات کا سماں ہے، خاموشی ہے، خلوت ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، یہ کیفیت دن کے وقت میں حاصل ہونا مشکل ہوتا ہے، اس لئے رات کو منتخب فرمایا اور دوسری جگہ ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ

---

(۱)سورۃ الفرقان: آیت (٦٤)

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ○ (۱)

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی یاد میں۔

دوسری جگہ فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (۲)

رات جو کم سوتے ہیں اور سحری کے وقت میں استغفار کرتے ہیں۔

بہر حال! یہ رات کی عبادت ہے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔

رات کی عبادت "نفس" کو کچلنے میں مؤثر

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ○ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ○ (۳)

ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ دن میں تو آپ بہت سے کاموں میں رواں دواں رہتے ہو اور تمہارے لمبے لمبے کام ہوتے

---

(۱)سورۃ السجدۃ: آیت (۱٦)

(۲)سورۃ الذاریات: آیت (۱۷ و ۱۸)

(۳)سورۃ المزمل: آیت (٦، ۷)

ہیں۔ رات کو اٹھنا نفس کو کچلنے میں اور بات بہتر طریقے پر کہنے میں مؤثر ہے۔ لہٰذا رات کی عبادت اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچنے کا قریب ترین ذریعہ ہے۔ رات کے بھی آخری حصے میں عبادت بہت بہتر ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی آخری شب میں اٹھنے کا تھا۔

عشاء کے بعد نوافل رات میں شامل

لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ فضل وکرم فرمایا کہ اگر کوئی شخص آخری شب میں نہیں اٹھ سکتا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ رکھا ہے کہ ''عشاء'' کی فرض نماز کے بعد نفل کی نیت سے جتنی رکعتیں بھی پڑھی جائیں، اس میں ''صلاۃ اللیل'' کا ثواب مل جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ: ''الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا'' میں شمار کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ اس آیت کا اصل اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ لوگ رات اس طرح گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں اور کبھی قیام میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رات کا بہت بڑا حصہ اس طرح گزار دیتے ہیں یا پوری رات اس طرح گزارتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اگر کسی شخص نے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ لی۔ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لی اور عشاء کے بعد کچھ نفلیں پڑھ لیں تب بھی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو محروم نہیں فرماتے بلکہ ان لوگوں میں شامل فرما دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا تعلق قائم کرو

یہ آیت یہ بتا رہی ہے کہ جو ''رحمٰن کے بندے'' وہ رات کے وقت

اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں۔ ''بندگی'' کا کم سے کم حق یہ ہے کہ وہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے۔ جو فرائض ہیں وہ تو ادا کرنے ہی ہیں، لیکن کچھ نوافل بھی ادا کرنے ہیں، اس لئے کہ ''فرائض'' تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت کا حق ہے۔ وہ تو ادا کرنے ہی ہیں، لیکن ''نوافل'' اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہے۔ کسی سے تعلق رکھنے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے کھردرا اور قانونی تعلق قائم کرلیں۔ مثلاً بیوی سے آپ نے قانونی تعلق قائم کرلیا اور اس سے کہا کہ ہم تم کو نان نفقہ دیں گے، کھانا پینا دیں گے، لیکن بیوی سے کبھی خوش طبعی سے بات ہی نہیں کرتا اور نہ اس کے ساتھ حسنِ معاشرت نہیں کرتا۔ یہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ صرف قانونی تعلق ہے۔ لیکن اگر محبت کا تعلق ہے تو پھر نان ونفقہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص بیوی کے ساتھ صرف قانونی تعلق رکھے گا تو اس کی زندگی خوشگوار نہیں ہوسکتی۔

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' رات کے وقت کبھی قیام میں کبھی سجدے میں

اسی طرح اگر کوئی شخص صرف فرائض کی ادائیگی پر اکتفا کرے اور نوافل ادا نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق قائم رکھا ہے کہ یا اللہ! تو میرا رب ہے اور میرا تیرا بندہ ہوں۔ بس! آگے مجھ سے کچھ مطالبہ نہ کرنا۔ لیکن اگر بندہ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو وہ بندہ صرف فرائض کی ادائیگی پر اکتفا نہیں کرے گا، بلکہ وہ نوافل بھی ادا کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کرے گا اور ذکر واذکار بھی کرے گا اور تلاوت قرآنِ کریم بھی

کرے گا۔ اس لئے یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہے۔ لہٰذا یہ جو "رحمٰن کے بندے" کے بارے میں فرمایا:

الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا (1)

مطلب یہ ہے کہ وہ صرف فرائض کی ادائیگی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ نوافل پڑھتے ہوئے کبھی سجدے میں ہوتے ہیں اور کبھی قیام میں رہتے ہیں۔

رات کو تہجد پڑھنے کا معمول بنائیے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب نقشہ کھینچا ہے اور بڑے پیار سے فرمایا کہ: "الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا" اس لئے رات کو تہجد پڑھنے کا معمول بنانا چاہئے۔ اس کے لئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ آخری شب میں اٹھ کر کچھ نوافل ادا کرے، البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی وجہ سے آخر رات میں نہیں اٹھ سکتے تو کم از کم عشاء کی فرض کے بعد کچھ رکعتیں "صلاۃ اللیل" کی نیت سے پڑھنا چاہئے اور ساتھ میں یہ نیت بھی ہو کہ اگر آخری شب میں آنکھ کھل گئی تو انشاء اللہ اس وقت بھی اٹھ کر مزید رکعتیں پڑھوں گا۔

وتر کی نماز کب پڑھی جائے؟

وتر کی نماز تو اوّل شب میں ہی پڑھ لینا ہم جیسے کمزوروں کے لئے بہتر ہے۔ اور آخر شب میں جب آنکھ کھل جائے تو اس وقت نمازِ تہجد اور "صلاۃ اللیل"

---

(1) سورة الفرقان: آیت (٦٤)

آدمی پڑھ لے اور اس وقت دوبارہ وتر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وتر کے بعد کوئی نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ یاد رکھئے ناجائز نہیں ہے، بلکہ ایسی صورت میں پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اول رات میں وتر اس لئے پڑھ لے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری رات میں میری آنکھ نہ کھلے اور میں وتر سے محروم رہ جاؤں۔

اس صفت کا تعلق حقوق اللہ سے

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی پہلی صفت جو اس آیت میں بیان فرمائی کہ ''اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا'' یہ خود بندے کی اپنی صفت کا ذکر ہے۔ وہ ہے ''تواضع'' اور دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ: ''وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' اس صفت کا تعلق ''حقوق العباد'' سے ہے اور تیسری صفت جو اس آیت میں بیان فرمائی کہ: ''اَلَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا'' میں اس صفت کا تعلق ''حقوق اللہ'' سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس صفت پر عمل کرنے کا موقع کم ملتا ہے

عام حالات میں اس تیسری صفت پر عمل کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ بہت سے اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہیں جو الحمد للہ! قیام اللیل کے بعد رات کے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے عبادت کرنے کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی ہے، لیکن بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو رات کو اٹھ کر عبادت نہیں

کرپاتے۔ اب رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے، یہ اس لئے آرہا ہے کہ اس ماہ مبارک میں ''قیام اللیل'' کا کچھ حصہ ہم نے سنتِ مؤکدہ قرار دے دیا۔ گویا کہ جبری قیام کروادیا ہے۔ اب چاہے تم کسی بھی حالت میں ہو، سستی ہو رہی ہو، لیکن بیس رکعات تو پڑھنی ہے اور بیس رکعتیں پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ چالیس سجدے کرنے ہیں۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ ''چالیس مقاماتِ قرب ایک مؤمن کے لئے رمضان المبارک میں بڑھا دیئے۔''

یہ رمضان المبارک کی برکت ہے

وہ لوگ جو عام دنوں میں پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور مسجدوں میں نہیں آتے، لیکن تراویح کے اندر وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جو سارے سال مسجدوں میں نظر نہیں آتے۔ یہ کون ان کو بلا رہا ہے؟ کون ان کو کھینچ کر لا رہا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں ایسی برکت عطا فرمادی کہ دل کے اندر خود بخود ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، چاہے کیسا بھی گیا گزرا مسلمان کیوں نہ ہو، لیکن اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ رمضان ہے، اس رمضان میں وقت ضائع نہ کروں اور جو وقت ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر گزاروں۔ یہ احساس ہر ایک کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تراویح کے اندر بڑا اجتماع ہو جاتا ہے۔

سحری کے وقت نماز پڑھ لو

اور آخری شب، یعنی سحری میں آدمی کھانے کے لئے تو اٹھتا ہی ہے، ذرا

پہلے اٹھ جائے اور اس وقت میں تہجد کی چند رکعات ادا کرے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا خاص وقت ہوتا ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں کو تراویح کے لئے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں جمع فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ آپ مسجد میں لوگوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے ہیں اور ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک تو آپ نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا، لیکن ساتھ میں اس وقت یہ جملہ فرمایا کہ:

اَلصَّلَاۃُ الَّتِی یَنَامُونَ عَنھَا اَفضَلُ مِن صَلَاۃِ الَّتِی یَقُوْمُوْنَ بِھَا(۱)

فرمایا کہ جو لوگ اس وقت نماز پڑھ رہے ہیں یہ رات کو اٹھ کر جو تہجد پڑھی جاتی ہے اور اس وقت وہ لوگ سو جاتے ہیں۔ وہ زیادہ بہتر ہیں ان لوگوں سے جو اس وقت نماز پڑھ رہے ہیں۔

تہجد کی کتنی رکعات؟

اس سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوئی کہ تراویح علیحدہ چیز ہے اور تہجد علیحدہ چیز ہے اور دوسرے تہجد کی فضیلت حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی۔ لہٰذا سحری سے پہلے جتنی رکعتیں ہو سکے، چاہے ۴ رکعات ہوں، لیکن ان

---

(۱) صحیح البخاری ۳ / ٤٥ (۲۰۱۰)

کو دھیان سے پڑھو کہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے ''اَلَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا'' ایسے لوگوں میں داخل کردے کہ ہم رات اس طرح گزاریں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں۔ اس کے آگے کھڑے ہوں۔ ۴ رکعتیں ۶ رکعتیں، ۸ رکعتیں۔ جتنی اللہ تعالیٰ توفیق دے، ادا کریں اور جب سجدہ کرے تو اس وقت یہ تصور کرے کہ میں کہاں سجدہ کر رہا ہوں ۔

سر بہ قدم حسن قدم بر کلاہ و تاج
دیوانہ بڑی شان سے دیوانہ بنا ہے

''سجدہ'' قربِ خداوندی کا ذریعہ

سورۃ اِقرأ میں اللہ تعالیٰ نے کتنے پیار سے فرمایا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱)

''سجدہ کرو اور پاس آجاؤ۔''

اس سے پیاری اور کوئی دعوت ہوگی؟ کہ سجدہ کرو اور پاس آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمت سے اس کی توفیق دے دے۔ آمین۔ اس لئے کہ رحمٰن کے بندے کی صفت ہے ''عبدیت''۔ اور ''عبدیت'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوجائے اور عاجزی اختیار کرے، ناک رگڑے اور اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ پھر اس کو سب کچھ ملے گا۔ انشاء اللہ۔ کوئی پریشانی ہے؟ اللہ سے

---

(۱) سورۃ اقرا: آیت (۱۹)

مانگو۔ کوئی حاجت ہے؟ اللہ سے مانگو، فقر ہے؟ افلاس ہے؟ مانگو اللہ سے۔ البتہ یہ مت سمجھو کہ جو مانگ رہے ہو وہ فوراً مل جائے گا۔ یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو بندے کا گڑگڑانا پسند آتا ہے۔ جتنا گڑگڑائے گا وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا۔ اس لئے وہ چیز فوراً نہیں دی جاتی بلکہ کچھ وقت گزرنے کے بعد دے دی جاتی ہے۔

''دعا'' ہی عبادت ہے

بعض اوقات بندہ اللہ تعالیٰ سے ایک چیز مانگ رہا ہوتا ہے، لیکن وہ چیز اس کے حق میں مفید نہیں ہوتی، اس لئے وہ چیز نہیں دی جاتی، بلکہ کوئی اور اس سے اچھی چیز دے دی جاتی ہے۔ لیکن ''دعا'' بذاتِ خود مقصود ہے۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ''(۱)

ایک حدیث میں ''مُخُّ الْعِبَادَةِ''(۲) کے الفاظ ہیں اور اس حدیث میں ''هُوَ الْعِبَادَةُ'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی دعا ہی عبادت ہے۔

یابم او را یا نیابم جستجوئے میکنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

بندے کا کام یہ ہے کہ جستجو کرتا رہے، مجھے ملے یا نہ ملے، میں مانگتا رہوں

---

(۱) سنن أبي داؤد ۲ / ۳٦۲ (۱٤۷٤) و سنن الترمذی ٥ / ۳۸٦ (۳۳۷۲) وقال هذا حديث حسن صحيح.

(۲) سنن الترمذی ٥ / ۳۸٦ (۳۳۷۱) وقال: هذا حديث غريب.

گا۔ میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں، لیکن میں جستجو کرتا رہوں گا۔ لہٰذا ''دعا'' بذاتِ خود مقصود ہے۔ بس آدمی اس راستے پر چلتا رہے۔

عبادت میں اپنے آپ کو تھکاؤ

عمل کرتے کرتے ''تھک جانا'' بذات خود مقصود ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۱)

یعنی جب فارغ ہوجائیں تو عبادت میں اپنے آپ کو تھکائیں۔

میرا اس پر ایک شعر ہے کہ ؎

قدم ہیں راہِ الفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہوجانا

جب تھک کر چور ہوگیا تو منزل حاصل ہوگئی۔ یہی مقصود تھا۔ بس! انسان ذرا اپنی ہمت کو بڑھانے کی کوشش کرے اور یہ کہ میں ایک عظیم زمانے سے گزر رہا ہوں، آنکھوں سے انوار نظر نہیں آتے جو انوار اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینے میں رکھے ہیں وہ برکات نظر نہیں آتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ معنوی چیز ہیں۔ ان معنوی چیزوں کا بعض اوقات یہ اثر انسان پر پڑتا ہے کہ بندے کی رغبت عبادت کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الانشراح: آیت (۷)

ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرو

لیکن اس ہمت کو اور آگے بڑھاؤ کہ پہلے جتنی عبادت کیا کرتے تھے اب اس سے کچھ زیادہ عبادت کرے اور اگر سستی ہو رہی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کرو۔ مجاہدہ کرو، دل نہ چاہ رہا ہو، پھر بھی نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ تلاوت میں دل نہیں لگ رہا، مگر تلاوت کر رہا ہوں۔ نماز میں دل نہیں لگ رہا ہے، لیکن نماز پڑھ رہا ہوں۔ جب آدمی اپنے اوپر زبردستی کر کے یہ اعمال انجام دے گا تو اسی کا نام "مجاہدہ" ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کبھی محروم نہیں فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ کریم میں صاف صاف فرما دیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [1]

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ یوں فرماتے تھے کہ: "جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں"۔ "مجاہدہ" کے معنی ہیں "اپنے اوپر زبردستی کرنا" فلاں عمل کو دل نہیں چاہ رہا ہے، مگر کر رہا ہوں اور میری خاطر زبردستی کرتے ہیں۔ ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر پہنچا دیں گے۔ گود میں اٹھا کر پہنچا دیں گے۔

ان کو گود میں اٹھا کر پہنچا دیں گے

اس لئے کہ اس آیت میں "لَنَهْدِيَنَّهُمْ" کا فعل بلاواسطہ متعدی ہو رہا ہے۔ یعنی اس فعل کے دو مفعول بلا واسطہ آ رہے ہیں۔ اگر "إِلٰى" آ جائے، جیسے

---

(۱) سورة العنكبوت: آيت (٦٩)

"لَنَهْدِيَنَّهُمْ اِلٰی" تو اس کے معنیٰ ہوتے ہیں: "اِرَاءَةُ الطَّرِيقِ" لیکن جہاں یہ فعل براہ راست دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنیٰ ہوتے ہیں: "ایصال الی المطلوب" اس آیت میں ایسا ہی ہے۔ اس لئے حضرت والا اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "ہم ان کو گود میں اٹھا کر اور انگلی پکڑ کر ان کو اپنے راستے میں پہنچا دیں گے۔" اور یہ صلہ ہے "مجاہدہ" کرنے کا اور "مجاہدہ" یہ ہے کہ دل میں تنگی ہے، بدن میں تھکن ہے، ارادہ ڈھیلا ہے، طبیعت حاضر نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ عبادت کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا تو یہ "مجاہدہ" ہے۔

بس! ہمت کرنے کی ضرورت ہے

اب یہ ضروری نہیں کہ اس کو عبادت میں مزہ بھی آنے لگے۔ لیکن عبادت انجام دیئے جا رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرم ہو ہی جاتا ہے اور پھر اس کو زبردستی کی ضرورت نہیں رہتی اور پھر اس کے پاؤں خود بخود اٹھتے ہیں۔ اس کی ہمت خود بخود جوان ہوتی ہے۔ اس کے اعمال خود بخود اس طرف جاتے ہیں۔ لیکن شروع میں مجاہدہ تو کرنا پڑے گا۔ لہٰذا "مجاہدہ" کرو۔ اب آج کل رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے اب دن میں کھا نہیں رہے ہیں، پیاس لگ رہی ہے، لیکن پانی نہیں پی رہے۔ یہ مجاہدہ ہی ہے۔ اسی طرح رات کو سونے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن تراویح میں کھڑے ہیں۔ اسی طرح دل چاہ رہا ہے کہ ذرا دیر سے اٹھیں اور آخر وقت میں سحری کھا لیں۔ لیکن آدمی پہلے اس لئے اٹھ رہا ہے تا کہ چند رکعات تہجد کی پڑھ لے۔ اب "مجاہدہ" کرکے اٹھ رہا ہے۔ لیکن چند دن مجاہدہ ہوگا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس عبادت میں لذّت بھی عطا فرما دیں گے۔

لذّت کی خاطر نماز مت پڑھو

اور اگر لذّت نہ بھی ملے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس لئے کہ لذّت خود مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود تو اللہ کی رضا ہے۔ مقصود تو اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ لہٰذا اگر ساری زندگی عبادت میں لذّت نہ آئے تو کوئی پرواہ نہیں۔ قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں اس شخص کو مبارکباد دیتا ہوں جس کو ساری زندگی کبھی نماز میں مزہ نہ آیا، مگر وہ نماز پڑھتا رہا، کیوں؟ اس لئے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص مزہ کی خاطر نماز نہیں پڑھ رہا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نماز پڑھ رہا تھا۔ اس لئے اگر عبادت میں مزہ آئے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اگر نہ آئے تو مزہ نہ آنے کی صورت میں یہ نہ سمجھے کہ میں مطرود یا محروم ہوگیا۔ پہلے لذّت آتی تھی، اب نہیں آتی۔ پہلے زیادہ رونا آتا تھا، اب نہیں آتا۔ پہلے رقت طاری ہوتی تھی، اب نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں محروم ہوگیا۔ نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوا، اور جب اس ذات نے اپنی بارگاہ میں حاضر ہونے کی توفیق دے رکھی ہے تو یہ کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ کبھی آئی، کبھی نہیں آئی، آئی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، نہ آئے تو اپنے کو محروم نہ سمجھو۔

وہ سجدہ جسے تیرے آستاں سے نسبت ہے

بس! عمل کو دیکھو کہ عمل ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر عمل ہو رہا ہے تو وہ عمل تمہیں ایک دن منزل تک پہنچا دے گا۔ انشاء اللہ! اور اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچائے گا اور جب اللہ تعالیٰ دیکھیں گے کہ بندہ میرے لئے عمل کئے جا رہا ہے تو ایک دن لذّت بھی دے دیں گے۔ پھر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سجدہ میں پڑا ہوا

ہے اور اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ نہ بھی ہو تو بھی مقصود حاصل ہے۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جسے تیرے آستاں سے نسبت ہے

ایک بزرگ کی حکایت

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ روزانہ رات کو تہجد کے لئے اٹھتے تھے اور ان کا ایک شاگرد بھی ساتھ ہوتا تھا، ایک دفعہ وہ رات کو تہجد کے لئے اٹھے، اس وقت آسمان سے ایک آواز آئی کہ نہ تیرا وضو قبول، نہ تیری عبادت قبول، نہ تیری نماز قبول۔ اپنے کانوں سے یہ آواز سنی۔ لیکن پھر اطمینان سے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ جب اگلے دن اٹھے تو پھر وہی آواز آئی۔ اپنے کانوں سے آواز سنی اور اب شاگرد کو بھی آنے لگی۔ پھر اطمینان سے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ تیسرے دن جب اٹھے تو پھر وہی آواز آئی۔ شاگرد نے کہا کہ حضرت! جب بار بار آپ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کی نماز قبول ہی نہیں تو پھر کیوں رات کو اٹھ کر محنت کر رہے ہیں اور یہ مشقت برداشت کر رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر کوئی اور بارگاہ کوئی اور چوکھٹ ہو تو وہاں چلا جاؤں؟ کوئی اور بارگاہ تو ہے نہیں۔ اب چاہیں یہ قبول کریں یا قبول نہ کریں۔ میرے پاس تو یہی ایک بارگاہ ہے، میں تو عمل کرتا رہوں گا۔ جب ان بزرگ نے یہ کہا تو اب آواز آئی کہ

قبول است اگرچہ ہنر نیست
کہ جز ما پناہِ دگر نیست

کہ اب تیرا سب کچھ قبول ہے، تیرا وضو قبول، تیری نماز قبول، تیری عبادت قبول۔ اگر چہ تیری عبادت میں ہنر نہیں ہے۔ کیوں قبول ہے؟ اس لئے کہ ہمارے سوا کوئی اور تیری پناہ گاہ بھی تو نہیں ہے۔ تیرے لئے کوئی جائے پناہ بھی تو نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ان کا امتحان تھا اور اللہ کے بندوں پر اس طرح امتحان بھی آتے رہتے ہیں۔ ان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اگر وہ بزرگ اس شاگرد کی بات مان کر عبادت چھوڑ کر بیٹھ جاتے تو معاملہ ختم ہو جاتا۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے دل میں صحیح بات ڈالی اور انہوں نے کہا کہ اس بارگاہ کو چھوڑ کر اور کہاں جاؤں؟

خلاصہ

اس لئے بھائی! وہی پناہ گاہ ہے، وہی درگاہ ہے، وہی آستانہ ہے۔ اسی کی طرف ماہِ رمضان میں خاص طور پر بلایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس دعوت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۶

''عباد الرحمٰن'' پانچواں حصہ

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ

عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعا

دعا نمبر ۲۶ ''عباد الرحمٰن'' پانچواں حصہ

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا

الحمد للہ رب العالمین، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! گزشتہ چند مجلسوں سے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے اور تین صفات کا بیان -الحمد للہ- قدرے تفصیل سے ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر بھی یہ صفات پیدا فرمادے آمین

آگے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی ایک دعا بیان فرمائی کہ یہ لوگ ایک طرف تو رات کے وقت اللہ تعالیٰ کی حضور اس کی بارگاہ میں کھڑے ہیں اور کبھی سجدے میں ہیں اور کبھی قیام میں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کردیجئے۔ اس لئے کہ جہنم کا عذاب بڑا شدید ہے۔

اب دیکھئے کہ یہاں ان بندوں کا بیان ہو رہا ہے جو متواضع بھی ہیں اور جو لوگوں سے جھگڑتے بھی نہیں ہیں اور راتیں سجدے اور قیام کی حالت میں گزارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں۔ اس کے باوجود زبان پر یہ دعا ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب دور فرما دیجئے اور یہ دعا نہیں کرتے ہیں کہ ہمیں جنت دے دیجیئے۔ بلکہ یہ دعا کر رہے ہیں کہ ہم سے جہنم کا عذاب دور فرما دیجئے۔

نیک بندے ڈرتے رہتے ہیں

دوسری جگہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (۱)

وہ نیک بندے ہیں کہ وہ نیکی کا کام کر بھی رہے ہیں، لیکن ان کا دل سہما ہوا ہے اور دل میں خوف ہے کہ ہمیں بالآخر اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے اور اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔ جو عبادت ہم کر رہے ہیں وہ عبادت ہماری مقبول بھی ہے یا نہیں؟ اور وہ عبادت اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس وجہ سے وہ نیک بندے ڈرتے رہتے ہیں۔

عمل کرتے رہو اور ڈرتے رہو

اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کرتا رہے اور

(۱) سورة المؤمنون: آیت (٦٠)

اللہ سے ڈرتا رہے۔ عمل کرنے کے بعد یہ سمجھ کر میں جنت کا مستحق بن گیا اگر ہم عبادت کو کتنی بھی بن سنوار کر لیں پھر بھی اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت ہمیں جنت میں لے جانے کے بجائے نفس کے وساوس اور شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہماری یہ عبادتیں بیکار نہ ہوجائیں۔ اس وجہ سے عمل کرنے کے بعد ڈرتے رہتے ہیں۔ عمل کر بھی رہے ہیں اور ڈر بھی رہے ہیں۔

بعض اوقات شیطان دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ بھائی! تم نے تو تہجد کی نماز پڑھی، تم نے رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، لہٰذا تم تو بہت اونچے مقام پر پہنچ گئے۔ اس موقع پر آدمی خود اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ میں تو بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہوں۔ عربی میں ایک مثل مشہور ہے کہ

صلی الحائك رکعتین وانتظر الوحی

یعنی ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعتیں پڑھ لی تھیں، اس کے بعد اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ میرے اوپر "وحی" نازل ہوگی۔ بعض اوقات ہم لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تھوڑی بہت عبادت کرنے کی توفیق دے دی تو اب دل میں ناز پیدا ہوگیا اور دل میں خیال آنے لگا کہ "فلاں آدمی کیا ہے؟ وہ تو کچھ بھی نہیں کرتا، ہم تو رات کو کھڑے ہو کر تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔" شیطان یہ خیال دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

شیطانی خیال کا علاج

اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی نیک عمل کرے بھی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے بھی

اور اللہ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میں نے جو کچھ عبادت انجام دی ہے وہ کھوٹی پونجی ہے، آپ اپنے فضل وکرم سے اس کو کھرا بنا دیجئے اور اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول فرمالیں تو یہ آپ کی رحمت ہے ورنہ ہمارا عمل اس لائق نہیں کہ وہ ہمیں جنت تک پہنچا دے۔

حضرت جنید بغدادی کے دو جملے

حضرت جنید بغدادی کا یہ قول ہے کہ ''جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کا عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص فضول محنت کر رہا ہے اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر عمل کے جنت میں چلا جائے گا ایسا شخص جھوٹی امیدیں باندھ رہا ہے۔ لہٰذا عمل کرنا بھی ضروری ہے اور اس عمل کو اس قابل بھی نہیں سمجھنا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے بلکہ یہ سمجھو کہ جو ملے گا وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ملے گا۔ اگرچہ سنت اللہ یہ ہے کہ جو بندہ اخلاص کے ساتھ عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو قبول فرمالیتے ہیں اور اس پر ثواب بھی مرتب فرمادیتے ہیں اور جنت میں بھی داخل فرمادیتے ہیں۔

عمل جنت میں نہیں لے جائے گا

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کا عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کا بھی؟ فرمایا: ہاں! میرا بھی۔ اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِهٖ[1] جب تک

(۱) صحیح البخاری ۷ / ۱۲۱ (۵۶۷۳)

اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لے، اس وقت تک میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا۔ لہٰذا عمل کرے بھی، اور کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرے بھی اور یہ بات بھی ذہن میں رکھے کہ اپنی ذات میں میرا یہ عمل اس قابل نہیں ہے کہ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے۔ بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار رہیں۔

عبادت میں کوتاہیوں سے استغفار

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (۱)

یعنی اللہ کے نیک بندے راتوں کو کم سوتے تھے، اللہ کی عبادت کی وجہ سے لیکن سحری کے وقت استغفار کیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا وہ اپنے گناہوں سے استغفار کیا کرتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں! بلکہ وہ اپنی عبادت کی کوتاہیوں سے استغفار کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! آپ کی شایانِ شان جیسی عبادت کرنی چاہیے تھی۔ ویسی عبادت تو میں نہیں کر پایا، لہٰذا اس عبادت میں جو کمی کوتاہی رہ گئی یا اللہ! اپنے فضل وکرم سے اس کو دور فرمادے۔ (۲)

---

(۱) سورة الذاريات: آيت (۱۷ - ۱۸)

(۲) وروى الترمذي في سننه ٥/ ٣٣١ (٣١٧٥) نحوه.

ہر عبادت کے بعد شکر اور استغفار

اس لئے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عبادت کی توفیق عطا فرمادیں تو عبادت کے انجام دینے کے بعد دو کام کرے، ایک تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے "الحمدللہ" کہے، یا اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے عبادت انجام دینے کی توفیق دے دی۔ دوسرے استغفار کرے کہ یا اللہ! آپ نے تو عبادت کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں اس عبادت کا حق ادا نہیں کر پایا، مجھ سے کوتاہیاں ہوئیں، اے اللہ! اس پر میں استغفار کرتا ہوں، یہ دو کام کرلے۔ انشاء اللہ! اللہ کرم فرما دیں گے۔ ناز نہ کرے کہ میں نے یہ کرلیا، میں نے وہ کرلیا۔

دو انتہاؤں کے درمیان راستہ

یہ دو انتہائیں ہیں، جن کے درمیان سے راستہ گزرتا ہے، ایک انتہاء یہ ہے کہ ایک آدمی عمل کررہا ہے اور اس کے دل میں یہ خناس پیدا ہوگیا کہ میں بڑا عبادت گزار ہوں۔ اللہ بچائے! یہ بھی انسان کو جہنم میں لے جانے والا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگے کہ میں بہت بڑا عبادت گزار ہوں اور دوسروں کے مقابلے میں عبادت کے اعتبار سے زیادہ افضل ہوں تو یہ جہنم کا راستہ ہے اور دوسری انتہاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دی ہے اس پر ناشکری کرے۔ ہمارے حضرت اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ میری عبادت کیا میری نماز کیا۔ میرا قیام کیا، میرا سجدہ کیا؟ ہم تو ٹکریں مارتے ہیں۔ بس! یہ کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔

یہ پیشانی صرف ایک جگہ جھک سکتی ہے

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ یہ کہنا اس عبادت کی ناقدری ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کی ناقدری ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اس عبادت سے بھی محروم ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پیدا فرمایا اور ایسے لوگوں سے وابستہ فرمادیا، جس کی وجہ سے ہم ان عبادات کو انجام دینے کے قابل ہوگئے۔ یہ سب اس کی توفیق ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ حضرت والا خود ایک صاحب کا واقعہ بیان فرماتے کہ ایک صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ ہم تو ٹکریں مارتے ہیں، جب ہم سجدہ کرتے ہیں تو اس میں بھی شہوانی خیالات آتے ہیں۔ نفسانی خیالات آتے رہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا! سجدے میں نفسانی اور شہوانی خیالات آتے ہیں، بڑے گندے سجدے کرتے ہو، ایسا کرو کہ یہ گندہ سجدہ مجھے کرو، میں گندہ ہوں۔ لہٰذا گندہ سجدہ میرے لائق ہوگا۔

ان صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ سجدہ تو اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پیشانی کہیں اور جھک نہیں سکتی، یہ پیشانی تو صرف ایک ہی جگہ پر جھک سکتی ہے، چاہے خیالات آرہے ہوں چاہے وسوسے آرہے ہوں، لیکن صرف ایک جگہ پر جھکے گی، لہٰذا پہلے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرلو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے یہ پیشانی اپنے سامنے جھکانے کی توفیق عطا فرمادی۔

شیطان کا داؤ چل گیا

ہاں! بیشک میری طرف سے کوتاہی ہی کوتاہی ہے کہ میں اس کا حق ادا نہیں کرسکا، اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلو۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ ''كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ، وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ'' کہ سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں، کس چیز سے استغفار کرتے ہیں؟ اس چیز سے کہ یا اللہ! آپ کی عبادت کا جو حق تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہوسکا، اگر عبادت کرنے والے کے دماغ میں یہ خیال آگیا کہ میں نے عبادت کرکے بہت بڑا تیر مارا ہے۔ میں نے تو بہت بڑی عبادت کرلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوپر شیطان کا داؤ چل گیا۔

عمل کرتے رہو اور ڈرتے رہو

لہٰذا کرتے بھی رہو، ڈرتے بھی رہو، استغفار بھی کرتے رہو۔ جو بندہ یہ کام کرتا رہے گا ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کررہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نماز میں جانے کی توفیق دے دی۔ بہت سے اللہ کے بندے اس سے بھی محروم ہیں۔ اے اللہ! میرا اس میں کوئی کمال نہیں۔ آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے توفیق عطا فرمائی ہے۔ اس پر میں شکر ادا کرتا ہوں، لیکن جس طرح عبادت کرنی چاہئے تھی، اس طرح عبادت نہیں کرسکا۔ لہٰذا میں اس پر استغفار کرتا ہوں۔ جب بندہ ان دونوں چیزوں کو اکٹھا کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ چل جا! تیری عبادت کیسی بھی ہے، اچھی ہے یا بری

ہے، لیکن جب تو نے میری توفیق پر شکر ادا کر لیا اور میری عبادت کا حق ادا نہ کرنے پر استغفار کر لیا، تیرا سجدہ بھی قبول ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

فارغ آدمی کی نماز

یاد رکھیئے! اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلف نہیں فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا: ''لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا''[1] البتہ اس بارے میں آدمی آدمی میں فرق ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جس کو دنیا جہاں کی کوئی فکر نہیں، نہ اس کے ذمے فرائض اور ذمہ داریاں ہیں، ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، کوئی کام نہیں، جو کچھ کمایا تھا، اس کو کھا رہا ہے، یا اس کو کما کر کھلا رہے ہیں۔ ایسا شخص اگر نماز کے لئے پہلے سے جا کر اطمینان سے مسجد میں بیٹھ جائے اور ذکر کرتا رہے، اطمینان سے نوافل اور سنتیں پڑھے اور جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اس طرح اطمینان سے نماز پڑھے کہ دھیان صرف نماز کے اندر رہے، کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہ جائے۔

مشغول اور مصروف آدمی کی نماز

جبکہ دوسرا شخص وہ ہے جو مختلف تشویشات میں گرفتار ہے۔ اس کے اوپر بہت ساری ذمہ داریاں ہیں اور وہ ذمہ داریاں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک طالب علم ہے، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سبق یاد کرے یا مثلاً ایک استاذ ہے اس کے اوپر پڑھانے اور مطالعہ کرنے کی ذمہ داری ہے۔ ایک

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۳۳

آدمی اپنے روزگار میں پھنسا ہوا ہے اور اس کا دھیان اپنے روزگار کی طرف لگا رہتا ہے۔ پہلے شخص کے خشوع میں اور ان لوگوں کے خشوع میں لازمًا فرق ہوگا۔ ان لوگوں کا فریضہ اتنا ہے کہ اپنی طرف سے نماز کی طرف دھیان دینے کی کوشش کر لے۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ تشویشات بہت زیادہ ہیں، کبھی ادھر ذہن جا رہا ہے کبھی ادھر ذہن جا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا

لہٰذا غیر اختیاری طور پر تمہارا دھیان ادھر اُدھر چلا گیا تو ہم اس کو تمہارے خشوع کے خلاف نہیں سمجھیں گے۔

اپنے اختیار سے خیالات مت لاؤ

ہاں! اپنے اختیار سے اِدھر اُدھر کے خیالات مت لاؤ۔ مثلاً یہ کہ جب نماز پڑھوں گا کہ فلاں بات سوچوں گا۔ اب جب نماز میں کھڑے ہوئے تو اس بات کو یا اس مسئلے کو سوچ رہے ہیں۔ یہ گناہ ہے اور اس پر پکڑ ہے، لیکن غیر اختیاری خیالات پر کوئی پکڑ نہیں اور اگر غیر اختیاری خیالات ہیں تو دوبارہ نماز اور اذکار کی طرف لوٹ آئے۔ بس! اس کے ذمہ صرف اتنا کام ہے اور جب وہ نماز کے اندر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو خاشعین کی فہرست میں شامل کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی آسانی پیدا فرما دی ہے۔

نماز میں جہاد کی صفوں کی ترتیب

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أجهز جيشي وأنا في الصلاة[1]

بعض اوقات میں نماز کے اندر جہاد کی صفیں ترتیب دیتا ہوں۔

مثلاً یہ کہ کس صف میں کس کو کھڑا کرنا ہے، کس کو آگے کھڑا کرنا ہے، کس کو پیچھے کرنا ہے، کس کو داہنے طرف اور کس کو بائیں طرف کرنا ہے۔ وہ خلیفہ ہیں اور آدھی دنیا پر جس کی حکومت ہے، اس کے اوپر جو فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اور وہ فرائض اور ذمہ داریاں بھی دین ہیں۔ وہ کوئی دین کے خلاف نہیں ہیں۔ ان فرائض اور ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کے ذہن میں نماز کے اندر یہ خیال آرہا ہے کہ فلاں لشکر جب بھیجوں گا تو اس کی صف کس طرح بناؤں گا۔

یہ خوشی کے منافی نہیں

اب اس کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ چونکہ ذہن بہت ساری ذمہ داریوں میں الجھا ہوا ہے، لہٰذا نماز کے اندر ان کا ذہن خود بخود اس طرف غیر اختیاری طور پر چلا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ بعض فقہاء نے فرمایا اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تائید فرمائی۔ وہ یہ کہ اگر آدمی نماز کے اندر کوئی عبادت کی بات سوچے، چاہے اختیار سے سوچے تو یہ بھی خشوع کے منافی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ''جہاد'' افضل العبادات ہے۔ اب اگر وہ نماز کے اندر ''جہاد'' کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو یہ ایسی بات نہیں ہے، جس پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ فرمالیں۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱ / ٤٠٨ معلقا

حافظِ قرآن کا تراویح میں سوچنا

بہت سے حافظِ قرآن جو تراویح میں قرآنِ کریم سناتے ہیں، وہ جب نماز پڑھتے ہیں کہ نماز کے اندر سوچتے ہیں کہ اب آگے کہاں سے پڑھنا ہے، کہاں سے شروع کرنا ہے اور کہیں متشابہ تو نہیں آرہا ہے وغیرہ۔ یہ خیالات بھی چونکہ عبادت کے لئے ہیں، اس لئے وہ خشوع کے منافی نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے۔ اس لئے بعض فقہاء کرام یہ فرماتے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر بھی کوئی آدمی نماز کے اندر کوئی فقہی مسئلہ سوچنے لگے تو یہ خشوع کے منافی نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ بڑی عالمہ تھیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بھائی بڑے صوفی مزاج کے تھے، بڑے عابد زاہد تھے اور صاحبِ کشف تھے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم تھے، صوفی بھی تھے۔ لیکن علم کا غلبہ تھا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جب نماز پڑھاتے تو چھوٹے بھائی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ ایک دن ان کی والدہ نے ان سے پوچھا کہ تم ان کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ نماز میں حیض ونفاس کے مسئلے سوچتے رہتے ہیں۔ ایسے شخص کے پیچھے میں کیا نماز پڑھوں؟ ان کی والدہ عالمہ اور زاہدہ تھیں، انہوں نے فرمایا کہ وہ تو نماز میں دین کا مسئلہ سوچتا ہے اور تو نماز کے اندر اس کے عیب سوچتا ہے؟ اب بتاؤ، وہ بہتر ہے یا تو بہتر ہے؟

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور

بہر حال! انسان اس بات کا مکلف ہے کہ جب وہ نماز شروع کرے تو اس وقت اس بات کا تصور کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ یا اس وقت یہ تصور کرلے میں کعبہ کے سامنے کھڑا ہوں اوّل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا تصور کرے۔ لیکن ہم جیسے کمزوروں کے لئے ابتداء میں یہ تصور کرنا کہ میں ''بیت اللہ'' کے سامنے کھڑا ہوں اور جب انسان کعبہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے دل کو متوجہ فرمادیتے ہیں۔ یہ سوچ لے، اسی طرح جو الفاظ زبان سے ادا کررہا ہے، اس کی طرف دھیان کرلے یا امام کے پیچھے خاموش کھڑے ہونے کے وقت دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہے تو مختلف طریقوں سے توجہ کو لگانے کی کوشش کرتا رہے۔

میرا کام جستجو کرنا ہے

اور یہ کوشش مرتے دم تک جاری رہنی چاہئے۔ چاہے کامیابی ہو، یا نہ ہو، لیکن نہیں چھوڑنی۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم

میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں بس! میرا کام جستجو کرنا ہے، بس! آخری دم تک اس جستجو کو نہ چھوڑے تو ان شاء اللہ خشوع حاصل ہوجائے گا۔

"عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی دعا

بہر حال! "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی ایک صفت تو یہ بیان فرمائی کہ ایک طرف تو وہ لوگ راتیں سجدے کی حالت میں اور قیام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہوئے گزارتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○
اِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○ (۱)

یعنی اے پروردگار! ہم سے عذابِ جہنم کو دور کردیجئے کہ ہم عذابِ جہنم کے قریب بھی نہ جائیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (۲)

یعنی اللہ کے نیک بندے جہنم کی سرسراہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ اے اللہ! ہمیں ان میں داخل فرمادیجئے۔ یہ دعا ہم سب کو مانگنی چاہئے اور وہ جہنم ہر حالت میں بری ہے۔ چاہے آدمی اس کے اندر مستقل طور پر جا کر رہے، چاہے عارضی طور پر جا کر رہے "مستقر" اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں آدمی ہمیشہ رہے اور "مقاما" اس جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جہاں آدمی سفر کے دوران ایک دو دن کے لئے ٹھہر گیا۔ "جہنم" مؤمن کے لئے "مستقر" نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ اس لئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۶-۶۵)
(۲) سورۃ الانبیاء: آیت (۱۰۲)

"مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"(۱)

لہٰذا جو صاحب ایمان ہے اور جس نے کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہہ دیا، اس کے لئے جنت ہے، جہنم نہیں ہے، جہنم ایسے مؤمن کے لئے "مستقر" تو نہیں بن سکتی، لیکن "مقام" بن سکتی ہے۔ یعنی تھوڑے عرصے کے لئے اس کا ٹھکانہ بن سکتی ہے۔

جہنم ہر اعتبار سے بری ہے

انسان نے جو گناہ کئے ہیں، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کو کچھ دیر کے لئے یا کچھ دن کے لئے جہنم میں چھوڑ دیں، چاہے بعد میں اس کو نکال لیں اور جتنے صاحبِ ایمان ہے جن کے دلوں میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا انشاء اللہ، اس کو جہنم سے نکال دیا جائے گا اور وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ لیکن اپنے گناہوں کی بدولت کچھ عرصہ کے لئے جہنم میں اس کو رکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" یہ دعا کررہے ہیں کہ یا اللہ، یہ جہنم بری ہی بری ہے "مستقر" ہونے کے اعتبار سے بھی بری ہے کہ آدمی وہاں پر ہمیشہ رہے اور "مقام" ہونے کے اعتبار سے بھی بری ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں پر آدمی اپنے گناہوں کی سزا بھگت لے۔

جہنم میں نیند طاری کردی جائے گی

وہ "جہنم" ایسی جگہ ہے کہ ایک دن اور دو دن تو بڑی بات ہے، اگر

(۱) ماخوذ از صحیح البخاری ۱ / ۳۷ (۱۲۸) و مسند البزار کما فی کشف الأستار ۱ / ۱۱ (۷)

چند لمحوں کے لئے بھی اگر کسی آدمی کو وہاں جانا پڑے تو وہ بندے کے لئے ناقابلِ برداشت ہے، اگرچہ بعض روایات[1] میں یہ بھی آتا ہے کہ جو صاحبِ ایمان ہو، لیکن غلطیوں سے اور نادانیوں میں، جہالت میں اور بے فکری میں گناہ کر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں بھیجیں گے، لیکن وہاں اس کے اوپر نیند طاری کر دیں گے، تاکہ اس کو جہنم کے عذاب کی تکلیف زیادہ نہ ہو۔ یہ اس کے لئے ہوگا جو نادانی میں گناہ کر گزرا، وہ متکبر نہیں تھا اور وہ رعونت والا نہیں تھا اور ''فاجر'' نہیں تھا۔ ''فاجر'' سے مراد ہے وہ شخص جو اپنے گناہوں پر اصرار کرے اور ان کو اچھا سمجھے اور اس پر لوگوں سے بحث کرے اور اس کو گناہ ماننے سے بھی انکار کرے العیاذ باللہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''كُلُّ أُمَّتِيْ مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ''[2]

ایسے لوگ ''مجاہرین'' میں داخل ہیں جو کھلم کھلا گناہ کر رہے ہیں اور جب ان سے کوئی کہتا ہے کہ یہ گناہ ہے، مت کرو تو جواب میں کہتے ہیں کہ ساری دنیا کر رہی ہے، ہم کیوں نہ کریں یہ ''مجاہرین'' ہیں۔

جہنم کی بو بھی نہ سنگھایئے

ایک شخص وہ ہے کہ جو اعتراف کرتا ہے کہ واقعتاً یہ گناہ ہے، لیکن میں اس گناہ میں پھنسا ہوا ہوں اور میں اپنے نفس پر قابو نہیں پا رہا ہوں۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نکال دے، ایسے شخص کے بارے میں بعض روایتوں میں

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ۱۷۲ (۱۸۵) ومسند أحمد ۱۷ / ۲٤۰ (۱۱۱۵۱)
(۲) صحیح البخاری ۸/ ۲۰ (٦۰٦۹)

آتا ہے واللہ اعلم کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جہنم میں ڈالیں گے، لیکن وہاں اس پر نیند طاری کر دیں گے، پھر جب ہوش آئے گا اور چلانے لگے لگا، پھر نیند طاری کر دی جائے گی، پھر رونے چلانے لگے لگا، پھر نیند طاری کر دی جائے گی۔ یہ روایت کس درجہ کی ہے؟ واللہ اعلم۔ میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر ۵ منٹ کے لئے بھی آنکھ کھل گئی اور آگ کا سمندر ہے تو بتاؤ وہ قابلِ برداشت ہے؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگنی چاہئے کہ یا اللہ! ہمیں جہنم کی بوبھی نہ سنگھائے۔ اس کی سرسراہٹ بھی نہ سنائیے۔ اس لئے کہ وہ جہنم مستقل قیام گاہ کے لئے بھی اور عارضی قیام گاہ بننے کے لئے بھی برا مقام ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اپنی عبادت کرنے کی اور اپنی طرف رجوع کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرو اور ساتھ ساتھ اس بات سے ڈرتے بھی رہو کہ یا اللہ! ہم نے جو عبادت کی وہ ٹھیک ادا ہوئی یا اس میں غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں، اس پر استغفار کرتے ہیں۔ اگر ساری زندگی اس طرح گزر جائے کہ اس کی توفیق پر شکر ہو اور اس میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، اس پر استغفار کریں۔ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' میں شامل فرمالیں گے اور اللہ سے یہی امید رکھنی چاہئے کہ وہ داخل فرمالیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۷

''عباد الرحمٰن'' چھٹا حصہ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

فہرستِ مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دُعا

دعا نمبر ۲۷ ''عباد الرحمٰن'' چھٹا حصہ

وَ عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ، وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنۡ تَبِعَهُمۡ بِاِحۡسَانٍ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ اَمَّا بَعۡدُ!

''عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ'' کی پہلی صفت ''تواضع''

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ'' کا بیان کئی ہفتوں سے چل رہا ہے، اللہ جل شانہ نے اپنے خاص بندوں کی جو صفات سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں بیان فرمائی ہیں، ان صفات میں پہلی صفت یہ بیان فرمائی تھی کہ وہ لوگ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، یعنی ان کے اندر ''تواضع'' ہوتی ہے ''تکبر'' نہیں ہے۔ زمین پر عاجزی سے چلنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ تکبر سے خالی ہے۔ ''تواضع'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی یہ سمجھے کہ میری ذات میں کوئی کمال نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ سب اللہ جل شانہ کی عطا ہے، وہ جب چاہے، مجھ سے چھین لے۔ جب یہ احساس انسان کے دل میں جاگزیں ہوجاتا ہے تو

اس کا اثر انسان کے عقل وحرکت پر بھی پڑتا ہے۔ پھر اس کی ''چال'' میں بھی تواضع ہوتی ہے۔

دوسری صفت ''جھگڑوں سے پرہیز''

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی تھی کہ جب نادان لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کرتے ہیں، لڑائی کا جواب لڑائی سے نہیں دیتے، برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے، بلکہ سلامتی کا جواب دیتے ہیں، اگر جواب نہیں دینا تو بس ''السلام علیکم'' کہہ کر الگ ہوجاتے ہیں کہ آپ کی راہ اور ہے اور میری راہ اور ہے، لڑائی جھگڑے میں نہیں پڑتے۔

تیسری صفت ''راتیں عبادت میں گزارنا''

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اس حالت میں راتیں گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں، اور کبھی قیام میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

چوتھی صفت ''وحدانیت پر ایمان''

اب آگے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی چوتھی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۱)

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (٦٨)

یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔

یعنی وہ لوگ اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے اسرار اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ انسان کی عقل اور سمجھ بہت محدود ہے۔ اس لئے وہ اس کلام کے اسرار کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کے اوصاف ذکر فرمائے کہ ان کے اندر تواضع ہے وہ لوگوں سے جھگڑا نہیں کرتے، راتیں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر گزارتے ہیں، جو لوگ یہ سب کام کرتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ وہ لوگ مؤمن ہوں گے، اس لئے کہ ''توحید'' تو سب سے پہلی چیز ہے، اس کے بعد ہی یہ سارے اعمال آتے ہیں۔ لہٰذا اب یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ لوگ توحید کے بھی قائل ہیں۔ اگر وہ ''توحید'' کے قائل نہ ہوتے تو سجدے اور قیام میں راتیں کیسے گزارتے؟ اور ان کے اندر ''تواضع'' کیسے پیدا ہوتی؟ اور لوگوں سے لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کیسے کرتے؟ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ان کے اعمالِ صالحہ کا ذکر ہے اور پھر ''توحید پر ایمان'' کا ذکر ہے، ایسا کیوں؟

''توحید'' سے ''عملی توحید'' مراد ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے اسرار اور رموز تو وہی جانتے ہیں، انسان کی عقل تو بہت محدود ہے۔ البتہ ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے —واللہ سبحانہ اعلم— کہ درحقیقت یہاں ''توحید'' کے بیان کرنے سے مقصود

''علمی توحید'' نہیں بلکہ ''عملی توحید'' ہے۔ دیکھئے! ''توحید'' ایک ''علمی'' ہوتی ہے جو علمِ کلام اور علمِ عقائد کا موضوع ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جب تک آدمی اس بات کا اعتقاد نہ رکھے، اس کا ایمان ہی مکمل نہیں ہے، یہ ''توحیدِ علمی'' ہے اور ''نظریاتی'' ہے اور ''اعتقادی'' ہے کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کائنات کا رازق وہی ہے اور جتنے اعمال ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے صادر ہوتے ہیں۔

''عملی توحید'' اور ''مقامِ توحید''

حضرت صوفیاءِ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ''توحیدِ علمی'' کافی نہیں بلکہ انسان کو مکمل ہونے کے لئے اور اس کی اصلاحِ نفس اور تزکیہ کے لئے ''توحیدِ عملی'' ضروری ہے جب تک ''توحیدِ عملی'' نہیں ہوگی اس وقت تک بندہ صحیح معنیٰ میں بندہ نہیں بنتا اور وہ ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہوتا۔ صوفیاءِ کرام اس کو ''مقامِ توحید'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔ ''مقامِ توحید'' کیا ہے؟ چونکہ صوفیاءِ کرام دل کے حالات سے بحث کرتے ہیں اور دل ودماغ پر جو تصورات چھائے ہوتے ہیں ان کی طرف ان کی نظر ہوتی ہے وہ حضرات ان کو خالص کرنا چاہتے ہیں اور یہ شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ شریعت ہی کا ایک حصہ ہے۔

تمام کام ''اسباب'' کے پردے میں ہو رہے ہیں

دل میں یہ اعتقاد ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی

مشیت سے ہو رہا ہے، اس کے علم اور اس کے ارادے سے ہو رہا ہے، لیکن یہ ''اعتقاد'' دل میں اس طرح جما ہوا نہیں ہے کہ جو ''معاملہ'' بھی سامنے آئے، آدمی اس کے بارے میں یہ سمجھے کہ یہ میرے مولیٰ کی مشیت کا حصہ ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں جو معاملہ فرماتے ہیں، وہ کسی واسطے اور سبب کے ذریعہ فرماتے ہیں، اس کے نتیجے میں بندہ کا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کے بجائے ان اسباب کی طرف چلا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے مجھے تھپڑ مارا تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے اس نے تھپڑ مارا ہے۔ اس وقت دل میں یہ تصور نہیں آئے گا کہ اس تھپڑ مارنے والے کی کوئی حقیقت نہیں، اصل تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کچھ ہوا ہے وہ اس کی مشیت سے ہوا ہے۔

ہر غم اور ہر خوشی اللہ کی مشیت سے پہنچ رہی ہے

یہ تصور انسان کے دل پر چھاتا نہیں ہے اور اس تصور کا دل میں دھیان نہیں رہتا، ہونا یہ چاہئے کہ انسان کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آئے، چاہے وہ خوشی کا واقعہ ہو یا غم کا واقعہ ہو، خوشی اور غم کے موقع پر جو طبعی جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ ممنوع نہیں۔ لیکن ساتھ وہ انسان یہ سمجھے کہ یہ مشیتِ باری تعالیٰ کارفرما ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اگر مجھے کوئی غم پہنچا ہے تو وہ اس کی مشیت سے پہنچا ہے، اگر مجھے کوئی خوشی پہنچی ہے تو اس کی مشیت سے پہنچی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا

يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ[1]

یعنی اگر مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہے تو وہ بھی اس کی مشیت سے ہے اگر کوئی تکلیف پہنچی ہے تو وہ بھی اس کی مشیت سے ہے، کوئی خوشی پہنچی ہے وہ بھی اس کی مشیت سے ہے۔ یہ خیال دل میں جاگزیں نہیں ہوتا۔

اللہ کی طرف دھیان نہیں جاتا

اگر کوئی شخص دوسرے سے پوچھے کہ ساری کائنات میں اللہ کی کارفرمائی ہے یا کسی اور کی ہے؟ وہ زبان سے یہی کہے گا کہ اللہ کی ہے۔ لیکن وقت پر اس کا دھیان نہیں رہتا۔ جب صدمہ کا، غم کا، خوشی کا وقت آتا ہے تو دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کے بجائے ان واسطوں میں گھر جاتا ہے اور ایک ''وہم'' آجاتا ہے اور انسان اس وہم کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اصل حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

''لاش'' کے ساتھ سونے میں وحشت ہوتی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک بڑی عجیب مثال دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی لاش ہے، اس لاش کے بارے میں ہر انسان جانتا ہے کہ یہ بے جان ہے، اس میں روح نہیں ہے، اس کے اندر نہ کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے، نہ نقصان پہنچانے کی طاقت ہے۔ اس بات کا دل میں پکا یقین ہے، لیکن کسی انسان سے یہ کہا جائے کہ تم رات کے اندھیرے میں اس لاش کے ساتھ سو جاؤ! بتاؤ! کیا ہوگا؟ اس کو اس کے ساتھ سونے سے وحشت ہوگی، حالانکہ وہ جانتا ہے

---

(۱) سورۃ الفاطر: آیت (۲)

کہ یہ ''لاش'' نہ تو نقصان پہنچا سکتی ہے، نہ نفع پہنچا سکتی ہے۔ لیکن دماغ میں ایک وہم پیدا ہو رہا ہے، اس لئے اس کے ساتھ لیٹنے کو دل نہیں چاہتا۔(۱)

''توحید'' پر یقین کے ساتھ دل میں ''وہم''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یہ مثال دے کر فرماتے ہیں کہ اسی طرح دل میں ''توحید'' کا یقین تو ہے، لیکن ''وہم'' اس کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ ''وہم'' ظاہری اسباب ہیں۔ مثلاً جو مجھے مارا، وہ فلاں نے مارا، مجھے فلاں نے یہ چیز دی، اس طرح ان واسطوں کی طرف ذہن بھٹک جاتا ہے اور اصل کی طرف نہیں رہتا۔ لہٰذا اس ''وہم'' کو زائل کرکے اور ان اوہام کے بادلوں کو چھانٹ کر اللہ واحد کی طرف دل کو متوجہ کرنا اور اس کا استحضار رکھنا یہ ''توحیدِ حقیقی'' ہے اور ''توحیدِ عملی'' ہے اور ''مقامِ توحید'' ہے۔

''مقامِ توحید'' مراقبات سے حاصل ہوتا ہے

اور یہ ''مقامِ توحید'' مراقبات سے حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(۲)

---

(۱) احیاء العلوم للغزالی جلد ٤ / ٢٦٠ طبع دار المعرفة، بیروت

(۲) سورۃ آل عمران: آیت (۱۹۱)

یعنی تھوڑی دیر کے لئے آدمی بیٹھ کر یہ مراقبہ کرے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ میرے پروردگار کے حکم سے ہو رہا ہے اور اس کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ یہ پرندہ جو میرے سامنے اڑ رہا ہے یہ کسی کے حکم سے اڑ رہا ہے، کسی کی مشیت سے اڑ رہا ہے اور کسی مقصد سے اڑ رہا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا مقصد ہے؟ اب ہم روزانہ پرندوں کو اڑتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن ذہن اس کے خالق کی طرف، اس کے مالک کی طرف، اس کے چلانے والے کی طرف اور اس کے مقصد کی طرف نہیں جاتا۔

صوفیاءِ کرام کے مختلف مراقبات

صوفیاءِ کرام بعض اوقات جو مراقبات کراتے ہیں وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ ذرا یہ سوچا کرو، یہ پرندہ کیوں اڑا جا رہا ہے؟ اور یہ چیونٹی جو جا رہی ہے، اس کا بھی کوئی مقصد ہے۔ یہ چیونٹی خود نہیں چل رہی ہے، بلکہ کوئی ذات اس کو چلا رہی ہے، اس کے پیچھے کوئی مشیت کارفرما ہے اور یہ جا کر اللہ تعالیٰ کی مشیت کا کوئی مقصد حاصل کرے گی۔ یا چھپکلی جا رہی ہے، یا حشرات الارض جا رہے ہیں۔ یہ درختوں پر پتے حرکت کر رہے ہیں، ہوا کبھی تیز چل رہی ہے اور کبھی ہلکی چل رہی ہے۔ گرمی ہو رہی ہے، سردی ہو رہی ہے، یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟ یہ سب ایک خالق، ایک مالک کی مشیت کا عکس ہے۔ جب بندہ بار بار مراقبہ کرتا ہے اور تصور کرتا ہے تو پھر اس کے دل میں توحید جم جاتی ہے، اس کو صوفیاءِ کرام ”مقامِ توحید“ کہتے ہیں۔

پھر ہر حرکت کے پیچھے اللہ کی ذات نظر آتی ہے

اور جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس بندے کو ہر حرکت کے پیچھے ''اللہ'' کی ذات نظر آتی ہے۔ ہر جاندار کے پیچھے اور ہر بے جان کے پیچھے ''اللہ'' کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کی مشیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور جب یہ صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے بعد اگر بالفرض میرے سامنے کوئی خوشی کا واقعہ پیش آتا ہے تو میں اس خوشی کے واقعے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گا اور کہوں گا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اور اگر کوئی غم اور پریشانی کا واقعہ پیش آئے گا تو اس کو باری تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ قرار دے کر اس پر راضی رہوں گا اور یہ کہوں گا:

مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ

جو اللہ نے چاہا، وہ ہوگیا اور جو اللہ نے نہیں چاہا، نہیں ہوا۔
طبعی طور پر اس غم پر صدمہ ہوگا۔

یہ اسی کی مشیت کا فیصلہ ہے

مثلاً ایک آدمی کے گھر میں چوری ہوگئی اور اس کی ساری دولت لٹ گئی۔ اس پر اس کو صدمہ تو ہوگا؟ وہ ''صدمہ'' کوئی ممنوع اور گناہ بھی نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں یہ بات ہوگی کہ اصل میں اس کی کارفرمائی کہیں اور سے ہو رہی ہے اور یہ اسی کی مشیت کا فیصلہ ہے اور یقیناً اس فیصلے میں کوئی حکمت پوشیدہ

ہے۔ لہٰذا میں ''غم'' کا اظہار تو کر رہا ہوں لیکن ساتھ ہی اس فیصلے پر راضی بھی ہوں۔ جیسے ایک ڈاکٹر جب آپریشن کرتا ہے تو اس وقت وہ بندہ تکلیف سے چیختا ہے اور چلاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس آپریشن کے لئے راضی بھی ہے کہ یہ ڈاکٹر میری مصلحت کی وجہ سے کر رہا ہے۔ باوجود تکلیف کے وہ سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر میرا دشمن نہیں ہے بلکہ میرا خیر خواہ ہے۔

توحیدِ عملی کے نتیجے میں رضا بالقضاء

اس طرح بندے کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا غم پہنچتا ہے تو ایک طرف وہ غم بھی کرتا ہے اور اس غم کی وجہ سے رو بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود دل میں یہ اعتقادِ جازم موجود ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ میرے مالک کے فیصلے سے ہوا ہے۔ میں اس پر راضی ہوں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، میری مصلحت کے لئے کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا مصلحت ہے؟ اور جب یہ ''توحیدِ عملی'' حاصل ہو جاتی ہے تو وہ لازماً رضا بالقضاء پر منتج ہوتی ہے کہ میں ''تقدیر'' کے فیصلے پر راضی ہوں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔

ایک ایک بندہ کا اس کو علم ہے

لہٰذا بندہ ایک طرف اس بات کا اعتقاد رکھے کہ اس کائنات میں سارے کام باری تعالیٰ کے حکم سے ہو رہے ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ

وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ

الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (۱)

کسی درخت کا کوئی پتہ بھی نہیں گرتا، مگر یہ کہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ بھی حرکت کر رہا ہے تو باری تعالیٰ کے علم اور اس کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ ان باتوں کا دل میں اعتقاد تو ہے، لیکن اس کا استحضار نہیں ہے، اگر اس کی مشیت اور اس کی حکمت کے تحت مجھے کوئی زخم لگ گیا تو اب اس زخم کی فکر میں پڑا ہوا ہوں اور اس پر صدمہ ہو رہا ہے۔ ہائے یہ مصیبت میرے اوپر کیوں آ گئی؟ ہائے میرے ساتھ یہ کیا ہو گیا؟ ایسا کیوں ہوا؟ یہ درحقیقت اس اعتقاد کی نفی ہے۔ اس اعتقاد کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ بندہ یہ محسوس کرے کہ اس مالک کی طرف سے یہ فیصلہ ہے۔ میں اس کی حکمت کو نہیں مانتا، وہی حکیم ہے، وہی حاکم ہے، لہٰذا میں اس کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگرچہ مجھے تکلیف ہو رہی ہے یہ چیز ''مقامِ توحید'' حاصل ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

''مقامِ توحید'' کے نتیجے میں اعتقادِ جازم

اور ''مقامِ توحید'' اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ جب بندہ بار بار اس اعتقاد کا مراقبہ کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں یہ ''اعتقادِ جازم'' پیدا ہو جاتا ہے، اس کے بعد نہ تو کوئی ''لالچ'' اس کے اوپر کارگر ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ایک کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنا چاہتا ہے، چونکہ اس کو پتہ ہے کہ موت اور زندگی سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نفع، نقصان سب اس کے ہاتھ میں ہے، اگر کوئی مجھے لالچ دے رہا ہے تو میں لالچ سے مرعوب نہیں ہوں گا، یہ مجھے اگر ڈرا رہا ہے تو میں اس

(۱) سورۃ الانعام: آیت (۵۹)

سے نہیں ڈروں گا۔ بلکہ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی رہوں گا۔ ایسے شخص کو شدید ڈر کے موقع پر بھی ڈر نہیں ہوتا اور اس کو شدید لالچ کے موقع پر بھی لالچ نہیں ہوتا۔

اصل ''موحّد'' کی حالت

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

موحد بر پائے چہ ریزی زرش
کہ شمشیرِ ہندی نہد برسرش
امید وحراست نہ باشد ز کس
ہمیں است بنیاد ''توحید'' وبس

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''موحّد'' وہ ہے کہ اس کے پاؤں میں سونے کے خزانے ڈال دو، اور اس کو یہ لالچ دلاؤ کہ یہ غلط کام کرلو تو کبھی وہ غلط کام نہیں کرے گا اور اس کے سر کے اوپر ہندی تلوار رکھ دو، تو اس کو نہ کسی سے امید وابستہ ہوگی اور نہ کسی سے ڈر ہوگا۔ توحید کی بنیاد یہی ہے۔

پھر نہ کسی سے امید، نہ کسی کا خوف

لہٰذا جب بندہ کو ''مقامِ توحید'' حاصل ہوجاتا ہے تو وہ بندہ نہ تو کسی سے بہت زیادہ امید وابستہ کرتا ہے کہ یہ مجھے کچھ دے دے گا، یا مجھے کچھ فائدہ پہنچا دے گا اور نہ کسی سے ڈر اس پر اتنا غالب ہوتا ہے، بلکہ وہ یہ جانتا ہے کہ جو کچھ ملے گا وہ میرے مالک کی طرف سے ملے گا اگر کوئی ضرر پہنچے گا تو اللہ تعالیٰ کی

طرف سے پہنچے گا۔ اس لئے اس کو نہ تو کسی سے امید وابستہ ہے اور نہ خوف کسی سے وابستہ ہے۔ امید ہے تو ایک سے ہے اور خوف ہے تو ایک سے ہے۔ یہ ہے ''مقامِ توحید''۔

شر کو اللہ کی طرف منسوب نہ کرے

اور جب بندہ بار بار یہ مراقبہ کرتا ہے کہ اس کائنات میں ہر کام کسی مالک کی مشیت سے ہو رہا ہے، اسی کی مشیت کارفرما ہے اور کسی کی زیر تربیت یہ مراقبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو ''اِفراط اور تفریط'' سے محفوظ رکھتے ہیں۔ دیکھئے: ایک طرف تو یہ ''مقامِ توحید'' ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے، مجھے اگر کوئی نقصان پہنچا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پہنچا ہے۔ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ''خیر'' کو اللہ کی طرف منسوب کرے اور اگر ''شر'' ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرے اگرچہ وہ ''شر'' بھی انہی کی طرف سے ہے، لیکن ''شر'' کو ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرے۔

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا ادب

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام فرماتے ہیں کہ:

الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ ○ وَ الَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ○ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ○ [1]

(۱) سورۃ الشعراء: آیت (۷۸ تا ۸۰)

میرا پروردگار وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہ ہی مجھے راہ بھی دکھاتا ہے اور جو مجھے کھانا کھلاتا ہے اور جو مجھے پانی پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

اگرچہ بیماری بھی اسی کی طرف سے آرہی ہے، ان کی مشیت سے آرہی ہے، لیکن مقامِ ادب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرے۔ بلکہ اپنی طرف منسوب کرے اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "بیماری" کو اپنی طرف منسوب کیا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کا ادب

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ آپ سب حضرات جانتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا تختہ توڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے توڑا، لیکن اس کے توڑنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ [1]

یعنی میں نے یہ چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار بنادوں تاکہ بادشاہ ان کی کشتی کو عیب دار ہونے کی وجہ سے ان سے چھین نہ لے۔ اس لئے "اَرَدْتُّ" فرمایا۔

(۱) سورۃ الکہف: آیت (۷۹)

اچھے کام کی نسبت اللہ کی طرف کردی

اور جہاں بچے کو قتل کیا تو اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝(۱)

یعنی ہم نے چاہا۔ یعنی اللہ کی مشیت نے چاہا کہ اس بچے کے بدلے میں اس کے ماں باپ کو اچھا بچہ عطا فرمائیں۔ اور جہاں دیوار سیدھی کی تھی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا (۲)

یعنی یہ یتیموں کی دیوار تھی، اس دیوار کے نیچے ان یتیموں کا خزانہ تھا، اس لئے تمہارے پروردگار نے ارادہ فرمایا کہ یہ بچے جب جوان ہوجائیں اس وقت وہ اپنا خزانہ دیوار کے نیچے سے نکال لیں۔ چونکہ یہ اچھا کام تھا، اس لئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کردی اور کشتی توڑنے کی نسبت اپنی طرف کردی۔ اب ہر عمل میں اسی کی مشیت کارفرما تھی، کشتی کو اسی کے حکم سے توڑا اور بچے کو بھی اسی کی حکم اور مشیت سے قتل کیا، لیکن عیب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی۔

ادب کا تقاضا

لہٰذا جب ''توحید'' کا عقیدہ دل میں سما گیا وہ عقیدہ توحید ''حال'' اور

---

(۱) سورۃ الکھف: آیت (۸۱)

(۲) سورۃ الکھف: آیت (۸۲)

''مقام'' بن گیا اور ہر چیز کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی ذات کارفرما نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ''خیر'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرے اور ''شر'' کی نسبت اپنی طرف کرے۔

بندوں کا بھی شکر ادا کرو

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ اسباب کی کارفرمائی بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی سے ہو رہی ہے، لیکن دنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے اسباب سے متعلق کچھ احکام رکھ دیئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ کوئی احسان کیا ہے اب حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے واسطہ اس شخص کو بنا دیا۔ لہٰذا اس واسطہ کا حق یہ ہے کہ اس کا بھی ''شکریہ'' ادا کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

''مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ''(۱)

جو بندوں کا شکر ادا نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ لہٰذا اس بندے کا ''شکریہ'' بھی ادا کرنا ہے۔

ہر چیز اپنے محل پر ہونی چاہئے

اسی طرح اگر کوئی شخص آپ کو تکلیف پہنچائے تو اس کا جواب اور اس کی سزا شرعاً موجود ہے۔ مثلاً اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مارا تم بھی اس کو اتنی زور کا ایک تھپڑ

(۱) سنن الترمذی ۳ / ۵۰۵ (۱۹۵۵) وقال: هذا حديث حسن.

مار سکتے ہو۔ [1] بہرحال! ایک طرف تو ''توحید'' کا اعتقاد دل میں رچا بسا ہو اور دوسری طرف ہر چیز اپنے محل پر ہو۔ یہ ''تلوار سے زیادہ تیز'' اور ''بال سے زیادہ باریک'' ہے۔ اس لئے کہ ہر حکم کا حق ادا کرنا ہے، ایک طرف ''توحید'' کا عقیدہ ہے اور وہ عقیدہ دل میں رچا ہوا بھی ہے، دوسری طرف اسباب بھی ہیں اور ادب کا تقاضا بھی ملحوظ ہے اور ہر ایک کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔

پھر مخلوق کا خوف ختم ہو جائے گا

یہ کام صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت سے ہوتا ہے یا پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے وارثین کی تربیت سے ہوتا ہے۔ وہ حضرات فرماتے ہیں کہ دل میں ''توحید'' کا عقیدہ رچایا اور بسایا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر مخلوق سے خوف بھی کم ہو جائے گا اور مخلوق سے زیادہ امیدیں بھی وابستہ نہیں ہوں گی اور جب ''صدمہ'' آئے گا تو وہ صدمہ اپنی حدود میں رہے گا۔ حدود سے متجاوز نہیں ہوگا۔ اگر خوشی ہوگی تو وہ حدود کے اندر ہوگی، حد سے متجاوز نہیں ہوگی۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا:

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ [2]

یعنی جو نعمت تمہارے ہاتھ سے فوت ہوگئی، اس پر زیادہ غم نہ کرو اور جو نعمت حاصل ہوگئی، اس پر زیادہ اکڑ نہ ہو، بلکہ اعتدال ہو۔

---

(۱) کما قال سبحانہ وتعالیٰ: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرة: ۱۹۴)

(۲) سورۃ الحدید: آیت (۲۳)

جو چیز چلی جائے، اس پر زیادہ افسوس نہ کرو

دنیا میں واقعات اس لئے کرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ احد میں تمہیں تھوڑی سی شکست دلوائی اور بظاہر تمہارے دشمن تم پر غالب آگیا، یہ سب اس لئے ہوا کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے چلی گئی، اس پر زیادہ افسوس نہ ہو اور جو چیز ہاتھ آگئی، اس پر زیادہ اتراؤ نہیں۔ وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت تھی اور یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت ہے۔ اعتدال پر قائم رہنا یہ آسان کام نہیں ہے اور یہ بزرگوں کی صحبت ہی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں یہ نظریاتی طور پر تو سمجھ میں آگئیں، لیکن عملاً یہ بات حاصل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کو حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

بہرحال! ان آیات میں ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کی صفات بیان کرتے ہوئے درمیان میں ''توحید'' کا بیان لے آئے۔ درحقیقت ان صفات کی علت بیان ہو رہی ہے کہ ''توحید'' ان ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کے دل ودماغ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ یہ سارے اعمال ان سے صادر ہو رہے ہیں اور وہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہتے ہیں۔ اس لئے صفات کے بیان کے درمیان ''توحید'' کا بیان لاتے ہوئے فرمایا: وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔

کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے

پھر آگے دوبارہ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی صفات کا بیان شروع کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ [1]

یعنی وہ لوگ کسی ایسی جان کو قتل نہیں کرتے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرمت عطا کی ہے۔ مگر برحق۔

''برحق'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعتاً سزا کا مستحق تھا۔ مثلاً اس نے کسی کو قتل کردیا تھا اور اب قصاصاً اس کو قتل کرنا جائز تھا۔ اگر کسی نے حالتِ احصان میں زنا کا ارتکاب کیا تھا تو اس کو رجم کرنا جائز تھا۔ اسی طرح اگر کوئی مرتد ہوگیا اور اسلام سے پھر گیا تو اس کو قتل کرنا جائز تھا وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ کسی کی جان پر حملہ آور نہیں ہوتے۔

وہ زنا نہیں کرتے

آگے ایک اور صفت ''عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ'' کی بیان فرمائی کہ

وَلَا یَزۡنُوۡنَ

اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔

یہ درمیان میں جو منفی صفات بیان ہو رہی ہیں کہ وہ لوگ یہ نہیں کرتے، یہ نہیں کرتے۔ یہ درحقیقت کفار اور مشرکین کے اعمال کی طرف تعریض اور اشارہ ہے کہ اے مشرکو! وہ لوگ تمہاری طرح نہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور نہ قتل کرتے ہیں، جس طرح تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل کردیتے ہو اور نہ زنا کرتے ہیں، زنا بھی جاہلیت کے اندر ایک عام وبا تھی۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۸)

لوگ اس کو بھی برا عمل نہیں سمجھتے تھے، ان کی طرف اشارہ ہے کہ ''عِبادُ الرَّحْمٰنِ'' کبھی زنا نہیں کرتے۔

آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں

زنا کے بارے میں چونکہ قرآنِ کریم میں فرمایا ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (۱)

کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زنا کے جو مختلف پہلو ہیں، ان میں سے کوئی بھی اختیار مت کرو۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ وَزِنَاهُمَا النَّظَرُ (۲)

یعنی آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور آنکھوں کا زنا ''دیکھنا'' ہے۔

کسی غیر محرم کو لذّت لینے کی نیت سے دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے۔ اللہ بچائے۔ یہ زنا آج کے معاشرے میں ایسا پھیلا ہے کہ اس سے بچنا بظاہر مشکل ہوگیا ہے۔ ہر آدمی کی جیب میں زنا پہنچا دیا ہے۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی حفاظت نہ ہو اور خود اس شخص کی ہمت اور عزم نہ ہو تو پھر آدمی اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الاسراء: آیت (۳۲)

(۲) ماخوذ از صحیح البخاری ۸ / ٥٤ (٦٢٤٣)

زنا پر سخت وعید

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○ (۱)

یعنی جو شخص زنا کرے گا وہ اپنے گناہ کی سزا بھگتے گا وہ اس طرح بھگتے گا کہ قیامت کے روز اس کے عذاب کو دوگنا کردیا جائے گا اور اس میں ہمیشہ ذلیل ہوکر رہے گا۔ اتنی زبردست وعید زنا پر بیان فرمائی۔

جہنم میں اس کو کھینچ کر لایا جائے گا

فرمایا: "وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا" لفظ "فیہ" عام عربی میں "ہ" کو کھینچا نہیں جاتا، لیکن ہماری قرأت میں "فیہ" میں "ہ" کھینچ کر پڑھا جاتا ہے۔ "اشباع" کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس کو جو کھینچ کر پڑھا گیا ہے، اس سے اس طرح اشارہ ہے کہ اس کو جہنم میں کھینچ کر لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے آمین۔

جو شخص توبہ کرلے اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۸-۶۹)

اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ○[1]

جو شخص توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور عمل صالح کرے۔ جب بندہ یہ سب کام کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی سیئات کو بھی ''حسنات'' میں تبدیل کر دے گا۔ یعنی اس کے گناہوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو اتنا پسند فرماتے ہیں کہ جہاں اس کے اعمال نامے میں گناہ لکھے ہوئے تھے، حکم ہوگا کہ ہر گناہ کے بدلے میں ایک نیکی لکھ دو اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

چھوٹے چھوٹے گناہ اس کو دکھاؤ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے روز بندہ جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اس کے جو چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں وہ اس کو دکھاؤ۔ چنانچہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں گے۔ اب یہ بندہ ڈر رہا ہوگا کہ یا اللہ! جب یہ چھوٹے چھوٹے گناہ اتنے زیادہ ہیں تو اگر ان پر ہی میری پکڑ ہوگئی تو میں تو گیا۔ جب سارے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی لکھ دو۔ جب اللہ تعالیٰ یہ حکم فرمائیں گے تو اس وقت وہ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! میرے کچھ اور بھی گناہ تھے جو مجھے یہاں نظر نہیں آرہے ہیں؟ یہ بات بیان کرتے ہوئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔[2] یہ ہے اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۰)

(۲) صحیح مسلم ۱ / ۱۷۷ (۱۹۰)

رحمت کہ ''فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ''

توبہ کی عظمت وفضیلت

بہرحال! ''توبہ'' کی اتنی عظیم فضیلت دیکھو کہ آدمی کتنے گناہ کر گیا، سب کچھ کر گیا اور پتہ نہیں کس کس گناہ کے اندر مبتلا رہا، بس ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آکر سچے دل سے کہہ دیا کہ:

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ''

تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس بندے کے گناہ مٹا دو اور ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی لکھ دو۔ یہ ہے ''توبہ'' کی عظیم فضیلت۔ لہٰذا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے ڈرایا بھی کہ:

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (1)

کہ قیامت کے روز ان کو دوگنا عذاب ہوگا اور اسی میں ہمیشہ ذلیل ہوکر رہیں گے اور دوسری طرف خوشخبری بھی سنادی۔

ایک مرتبہ سچے دل سے توبہ کرلو

اگرچہ سارے گناہ تم نے کرلئے ہیں، لیکن ہم تمہیں ایسا نسخہ بتادیتے ہیں کہ گناہ کے سارے پہاڑ ایک لمحہ میں ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ ماضی میں تم نے جتنے گناہ کئے ہیں، ان سب کا تصور کرکے ایک مرتبہ سچے

(۱) سورة الفرقان: آیت (٦٩)

دل سے توبہ کرلو اور کہو کہ یا اللہ! میرے یہ سارے گناہ اپنے فضل سے معاف کردیجئے اور توبہ کے معنیٰ ہیں ''ندامت''، ''انما التوبۃ الندم'' کہ ''توبہ'' ندامت اور پشیمانی کا نام ہے کہ یا اللہ! مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی اور کہو:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ

یا اللہ! میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا اور آپ کے سوا کون ہے جو مجھے معاف کرے گا، لہٰذا آپ اپنے فضل سے معاف کردیجئے اور مجھ پر رحم فرمائیے۔

ایسی تیسی میرے گناہوں کی

بہرحال! ''ندامت'' کی توبہ کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس طرح دیتے ہیں کہ اس کی سیئات کو حسنات سے تبدیل فرما دیتے ہیں۔ جب یہ ندامت کی آہیں اٹھتی ہے کہ مجھ سے بہت سارے گناہ ہو گئے، بہت غلطیاں ہوگئیں، میں پشیمان اور شرمندہ ہوں، یا اللہ! میں کیسے اس کی تلافی کروں؟ یہ ندامت کی آہیں تمام گناہوں کو مٹانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ ہیں، حضرت بابا نجم الحسن صاحب۔ ہمارے بھائی کلیم صاحب کے منہ بولے نانا تھے، حقیقی نانا تو نہیں تھے، لیکن ان کے گھر میں رہتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے اور صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے۔ شاعر بھی تھے، ان کا ایک شعر

مجھے بہت پسند آتا ہے کہ۔

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

لہٰذا جب گناہ ہوجانے کے بعد ندامت کی آہیں مل جائیں اور پھر وہ استغفار اور توبہ کر لے تو وہ پہاڑ کے برابر ہو تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''توبہ'' کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور مرتے دم تک یہ کھلا رہے گا۔ اس لئے ہمارے بزرگ یہ تلقین فرمایا کرتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے بیٹھ کر توبہ کر لیا کرو۔ دن بھر میں جتنے بھی گناہ ہوئے ہیں، زبان بہکی، آنکھ بہکی تو ان سب سے توبہ کر لو اور کہو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ'' ان شاء اللہ محروم نہیں رہو گے۔

رات کو بیٹھ کر توبہ کر لیا کرو

انہی حضرت بابا نجم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک نوجوان حضرت کے پاس آیا۔ وہ اس لئے آیا کہ ان کے والد صاحب اپنا قلم بھول گئے تھے، ان کے والد صاحب نے بابا صاحب کی خدمت میں بھیجا کہ جا کر قلم لے آؤ۔ حضرت بابا صاحب نے اس کو قلم دے دیا۔ وہ نوجوان بالکل بے فکر قسم کے نوجوان تھے جس طرح بے فکر قسم کے نوجوان ہوتے ہیں، انہی کی طرح تھا، جب وہ نوجوان جانے لگا تو حضرت بابا نے ان سے فرمایا:

صاحبزادے! لوگ کہتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا مشکل ہے، ارے کچھ بھی مشکل نہیں۔ رات کو بیٹھ کر توبہ کرلیا کرو۔

یہ بات اس کے کان میں ڈال دی۔ حالانکہ وہ تو قلم لینے آیا تھا۔ اللہ کے نیک بندے کی بات اس کے دل میں اتر گئی اور اس عمل نے اس نوجوان کی زندگی بدل دی۔

شیطان زہر، توبہ تریاق

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا کیا، جو زہر ہے اور ہر زہر کا تریاق بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''استغفار'' اور ''توبہ'' کا تریاق عطا فرمایا۔ بس! اسی ''توبہ'' کے سہارے زندگی گزاردیں۔ بس! باری تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار اور ''توبہ'' کرتے ہوئے، اسی میں جان نکل جائے تو ان شاء اللہ جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۷

”عباد الرحمٰن“ ساتواں حصہ

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا

دعا نمبر ۲۷ ''عباد الرحمٰن'' ساتواں حصہ

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! گذشتہ کئی مجلسوں سے ''عباد الرحمن'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے، جو صفات اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں بیان فرمائی ہیں۔ ''عبادالرحمن'' کی بعض صفات کا بیان گذشتہ مجلسوں میں تفصیل سے ہو چکا۔ یاددہانی کے لئے اور ان کو تازہ کرنے کے لئے دوبارہ عرض کرتا ہوں، سب سے پہلی صفت جو بیان فرمائی ہے وہ ہے: ''تواضع'' یعنی بندگی کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ بندہ تواضع اختیار کرے، تکبر اور عجب سے بچے، عاجزی اختیار کرے۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لڑائی، جھگڑے سے بھی پرہیز کرتا ہے، اس لئے اللہ کو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلمانوں کے درمیان آپس کے جھگڑوں سے زیادہ مکروہ چیز کوئی نہیں۔

عباد الرحمن جھگڑوں سے بچتے ہیں

فقہ کی کتابوں میں جہاں معاملات کا ذکر ہے، وہاں بار بار یہ بات فقہاء نے بیان فرمائی ہے کہ جو چیز "مُفضی الی النزاع" ہو وہ عقد کو فاسد کر دیتی ہے، یعنی معاملات صاف صاف کرو۔ اگر کسی جگہ اندیشہ ہو کہ کسی وقت دونوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے گا، اس سے پرہیز کرو تو شریعت نے ایک ایک چیز میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو، بہر حال! دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ جھگڑتے نہیں۔ اور اگر دوسرا جھگڑے تو اس سے سلامتی کی بات کرتے ہیں، بعض اوقات جھگڑے سے بچنے کے لئے اپنا حق چھوڑ دیتے ہیں۔

عباد الرحمن کی تیسری اور چوتھی صفت

تیسرا وصف یہ بیان فرمایا تھا کہ رات کے وقت وہ کبھی سجدوں میں ہوتے اور کبھی قیام میں ہوتے ہیں۔ چوتھا وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ جہنم کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ:

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝
إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝ (۱)

ان کو اپنے عمل پر کوئی ناز نہیں کہ میں جو عمل کر رہا ہوں، بس اس کے بدلے مجھے جنت مل گئی اور میرا عمل مجھے جنت میں پہنچا دے گا، نہیں، بلکہ وہ

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۵ - ۶۶)

بندے عمل کرتے بھی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، اور یہ دعا بھی کرتے رہتے ہیں۔

عباد الرحمن کی پانچویں صفت

پانچویں صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (۱)

وہ بندے ایسے ہیں کہ جب خرچ کرنے کا موقع آتا ہے تو وہ نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں، اس لئے کہ یہ دونوں ہی برے ہیں، ''اسراف'' بھی برا ہے، اور ''بخل'' بھی برا ہے، اور جو اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے، جو صحیح راستہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ ہے۔

عباد الرحمن کی چھٹی صفت

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، جیسا کہ گذشتہ مجلس میں عرض کیا تھا کہ اس آیت سے ''مقامِ توحید'' کی طرف

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۷)

(۲) سورۃ الفرقان: آیت (۶۸)

اشارہ ہے اور یہ ان کے ایمان کے بارے میں جو وصف ہے، اس کو دوسرے اوصاف کے بعد لائے ہیں، اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو بندے ان اوصاف کے حاملین ہوتے ہیں، ان کو ایمان میں پختگی حاصل ہوتی ہے۔

امر بالمعروف سے ایمان میں پختگی

اس کی مثال وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۱)

دیکھئے! اس آیت میں بھی اوصاف کا ذکر پہلے کیا اور ایمان کا ذکر بعد میں کیا، چنانچہ فرمایا کہ وہ لوگ امر بالمعروف کرتے ہیں اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، یعنی لوگوں کو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ نیکی کی ترغیب دینا اور برائی سے روکنا ایمان کے بغیر تو نہیں ہوگا۔ میں نے "تبلیغی جماعت" کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے، ان کے واسطے سے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ "اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب آدمی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہتا ہے یعنی تبلیغ کرتا رہتا ہے تو اس تبلیغ کے نتیجے میں خود اس کا اپنا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ اس لئے اس آیت میں "وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" کو بعد میں لائے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہے، اس وجہ سے "ایمان" کا ذکر بعد میں فرمایا۔

---

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۱۱۰)

''عبادالرحمن'' کی ساتویں اور آٹھویں صفت

ساتویں صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ [1]

یعنی وہ لوگ کسی جان کو قتل نہیں کرتے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرمت عطا کی ہے مگر برحق۔

آٹھویں صفت یہ بیان فرمائی:

وَلَا يَزْنُوْنَ

اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔

اس کے بعد زنا کی سزا کا بیان فرمایا کہ:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا○

آگے توبہ کا ذکر فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○ [2]

ان آیات کے بارے میں گذشتہ مجلس میں تفصیل سے عرض کر دیا۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۶۸)

(۲) سورۃ الفرقان: آیت (۷۰)

ایسا شخص توبہ ہی کرتا ہے

پھر آگے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝ (۱)

ابھی پیچھے بیان کر چکے کہ جو شخص توبہ کرلے اور ایمان لے آئے، عملِ صالح کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو حسنات میں تبدیل فرمادیں گے، اب یہاں دوبارہ فرمارہے ہیں کہ:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝

یہ دوبارہ ذکر کرنے کی کیا ضرورت؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمارہے ہیں کہ جو شخص توبہ کرلے اور نیک عمل کرے تو:

فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا

اب اس آیت میں بظاہر موضوع، محمول ایک ہورہے ہیں، اگر آپ لفظی طور پر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ پہلے تو یہ کہہ دیا کہ جو شخص توبہ کرتا ہے اور ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی کرتا ہے، اس کی برائیوں کو ہم نیکیوں سے بدل دیتے ہیں، اس کو پہلے ہی اتنا بڑا انعام دے دیا، اب دوبارہ یہ فرمارہے ہیں کہ جو شخص توبہ کرتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے وہ توبہ ہی کرتا ہے۔ لفظی معنیٰ یہ ہیں تو یہ عجیب جملہ ہے۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۱)

توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آتا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ اس آیت میں جو لفظ "تاب" آیا ہے، اس سے مراد ہے "توبہ کرنا"۔ اس آیت کے اندر آگے لفظ "یتوب" جو لایا گیا ہے، یہ لفظی اور لغوی معنی میں ہے اور عربی زبان میں "تاب، یتوب" کے لفظی معنی ہیں "لوٹنا" اور "متاب" اس کا مصدر ہے، اگر اس آیت کا صحیح لفظی ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا کہ "جو شخص توبہ کرے، اور عمل صالح کرے تو وہ لوٹ آتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف ٹھیک لوٹ آنا۔"

اس لئے کہ "متابا" مصدر مطلق ہے، کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اس شخص نے سچی توبہ کی ہے اور سچی توبہ کی علامت یہ ہے کہ بعد میں نیک عمل کرے۔ جب وہ بار بار یہ کرتا ہے کہ توبہ بھی کر رہا ہے اور عمل صالح بھی کر رہا ہے تو پھر انجام اس کا یہ ہے کہ وہ بس اللہ کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

بعض اوقات توبہ ٹوٹ جاتی ہے

اس آیت میں ہم لوگوں کو زبردست بشارت اور تسلی دی جارہی ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ تمہارا توبہ کرنا اور ہم سے معافی مانگنا، یہ بیکار ہوجائے گا۔ بعض اوقات، خاص طور پر ہمارے جیسے لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور توبہ کرتے وقت عزم بھی ہوتا ہے کہ دوبارہ یہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن نفس وشیطان کے غلبہ سے بعض اوقات وہ توبہ ٹوٹ جاتی ہے، حالانکہ توبہ کے وقت عہد اور پکا عزم کیا تھا کہ آئندہ یہ حرکت نہیں کروں گا۔ لیکن کسی وقت گناہ کا موقع آیا تو آدمی پھسل گیا اور توبہ توڑ

دی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لئے قرآنِ کریم میں اعلان کر رکھا ہے کہ:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا [1]

اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

جس کو اس اعلان کا خیال آتا ہے تو اگرچہ توڑنے کے نتیجے میں ندامت ہوئی، شرمندگی ہوئی اور بڑا دکھ ہوا اور اپنے سے مایوسی پیدا ہونے لگی کہ میں تو کسی کام کا نہیں، اور میری اصلاح تو نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ میں توبہ کرتا ہوں، ٹوٹ جاتی ہے، توبہ کرتا ہوں، ٹوٹ جاتی ہے۔

اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ

ایسے شخص کیلئے اللہ تعالیٰ اعلان فرما رہے ہیں کہ ارے تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، لہٰذا جب تم سے توبہ ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ ''اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا''۔ لفظ ''ذنوب'' میں الف لام استغراق کا ہے، یعنی تمام گناہوں کی مغفرت کرتا ہے اور پھر لفظ ''جمیعا'' سے مزید تاکید فرما دی کہ جتنے گناہ کئے ہیں، سب کی مغفرت کر دے گا، لہٰذا تم واپس آجاؤ اور دوبارہ توبہ کر لو۔ لہٰذا جب آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف چلتا ہے تو کبھی وہ گرتا ہے، کبھی پڑتا ہے، پھر اُٹھتا ہے، پھر چل پڑتا ہے، پھر گرتا ہے، پھر اُٹھتا ہے، پھر چل پڑتا

---

(۱) سورۃ الزمر: آیت (۵۳)

ہے، لیکن ہمت نہیں ہارتا، جب کوئی بندہ ہمت نہ ہارے اور کوشش میں لگا رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ اس کو عملِ صالح کی توفیق دیدیں گے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں گود میں اُٹھالیں گے

اور جب اللہ تعالیٰ عمل صالح کی توفیق دیدیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا [1]

یعنی اب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ٹھیک لوٹ آئے گا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع جاری رکھو گے اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگتے رہو گے اور پناہ بھی مانگتے رہو گے کہ یا اللہ! میں ماضی پر معافی مانگتا ہوں اور مستقبل پر پناہ مانگتا ہوں اور مایوس ہوئے بغیر اگر یہ کام کرتے رہو گے تو ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گود میں اُٹھالیں گے۔

باپ بچے کو گرنے نہیں دیتا

جیسے بچے کو جب ماں باپ چلنا سکھاتے ہیں تو اس کو دور کھڑا کر کے اس کو بلاتے ہیں کہ آؤ بیٹا! ہمارے پاس آجاؤ، جب وہ آنے کی کوشش کرتا ہے تو گرنے لگتا ہے، لیکن باپ اس کو گرنے نہیں دیتا، بلکہ پکڑ کر دوبارہ کھڑا کر دیتا ہے اور پھر بلاتا ہے کہ میرے پاس آؤ بیٹا، اور جب بیٹے نے دو چار قدم آگے بڑھا لئے تو باپ اس کو آگے بڑھ کر گود میں اُٹھالیتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۱)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں

اب ہم تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بچے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں، ہم تو اسی طرح گرتے پڑتے رہیں گے۔لیکن اگر ہم نے ہمت نہ ہاری، اور کوشش جاری رکھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا جاری رکھی کہ یا اللہ! میرے بس میں جو تھا، وہ میں نے کرلیا، اب آپ خود مجھے کسی طرح سنبھال لیجئے تو اللہ تعالیٰ ضرور سنبھال لیں گے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1]

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے رہتے ہیں تو ضرور بالضرور لام تاکید با نونِ ثقیلہ اپنے راستوں پر ہم خود لیجائیں گے۔ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ہم خود تمہیں گود میں اُٹھا کر اپنے راستوں پر لے جائیں گے۔

ہمت مت ہارو

لہٰذا ہمت مت ہارو، اگر گناہ پر ندامت اور شرمندگی ہو رہی ہے، دکھ ہو رہا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہے ہو تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ:

فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا

کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ٹھیک ٹھیک لوٹ آئے گا۔ کبھی کبھی دل میں یہ

---

(۱) سورۃ العنکبوت: آیت (۶۹)

خیال آتا ہے کہ مثلاً ایک گناہ ہے، میں اُس سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہوں، اور توبہ بھی کرتا ہوں اور توبہ کے وقت دعا بھی مانگتا ہوں کہ یا اللہ! آئندہ مجھ سے یہ حرکت نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ گناہ دوبارہ ہوجاتا ہے۔ خیال یہ آتا ہے کہ جب میں نے اپنے اللہ تعالیٰ سے گزارش کردی اور اللہ تعالیٰ سے میں نے مانگ لیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس گناہ سے کیوں نہیں روکا؟

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت تو وہی جانتے ہیں، ہم اور آپ کہاں اس کی حکمت اور مشیت کا ادراک کرسکتے ہیں۔ لیکن اللہ جل جلالہ کو بعض اوقات بندے کا گرنا پڑنا بھی اس کی مشیت اور حکمت کے اندر داخل ہوتا ہے، کیوں؟ تاکہ یہ مزید روئے اور مزید میری طرف متوجہ ہوجائے، مزید مجھ سے توبہ کرے، مزید مجھ سے معافی مانگے، اور میں پھر اس بندے کو اپنی ستاری کا مورد بناؤں۔ اپنی غفاری کا مورد بناؤں۔

''استدراج'' کے معنیٰ اور علامت

دیکھئے! ایک ہوتا ہے ''استدراج''۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ فرمائے، آمین۔ ''استدراج'' کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی گناہ کے اندر مبتلا ہے اور وہ گناہ کئے جارہا ہے اور اللہ میاں اس کو ڈھیل دے رہے ہیں کہ اور گناہ کر۔ یہ ''استدراج'' بڑی خطرناک چیز ہے۔ ''استدراج'' کی علامت یہ ہے کہ ایسے آدمی کے دل میں توبہ کرنے کی فکر نہیں ہوتی، اور نہ اس کو گناہ پر ندامت ہوتی ہے اور نہ یہ فکر ہوتی ہے کہ میں یہ گناہ کیوں کررہا ہوں؟ بلکہ وہ آدمی سینہ تان کر گناہ کررہا ہوتا ہے۔

ہم سب ان گناہوں کے اندر مبتلا ہیں

اور ایک بندہ وہ ہے کہ جو گناہ سے توبہ کررہا ہے، لیکن شرمندگی کے ساتھ کررہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی ظاہر کرتا ہے، روتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوگیا، یا اللہ! مجھے اس گناہ سے بچالیجئے ! آئندہ میں اس گناہ میں مبتلا نہیں ہوں گا۔ آج کل جن گناہوں میں ابتلاء ہوتا ہے، ان میں نظربد کا گناہ سب سے خراب ہے، اس کے بعد غیبت کا گناہ ہے، اب جن لوگوں کا کسی بزرگ سے تعلق ہوتا ہے، ان سے یہ توقع تو مشکل ہے کہ وہ نماز چھوڑنے کا گناہ کریں گے یا وہ شراب پینے کا گناہ کریں گے، لیکن جو گناہ معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اہلِ علم کے اندر پھیلے ہوئے ہیں، وہ نظر کا گناہ ہے، کان کا گناہ ہے، یعنی غیبت کا سننا اور زبان کا گناہ، کہ زبان سے جو بات نکال رہا ہوں، یہ سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں، یا میں کسی بات کو کہتے ہوئے اتنا مبالغہ کررہا ہوں کہ وہ جھوٹ کی حدتک پہنچ رہا ہے، یا کسی کی غیبت کررہا ہوں، کسی پر بہتان لگارہا ہوں، کسی پر الزام لگارہا ہوں، یا کسی کی دل آزاری کررہا ہوں۔

مایوس نہیں ہونا چاہئے

یہ سب گناہ عام ہیں، ہم سب ان کے اندر مبتلا ہیں، لہٰذا پہلے تو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ یہ سارے کام گناہ ہیں اور احساس ہونے کے بعد شرمندگی ہونی چاہئے۔ غیبت کرلی، لیکن اس پر کوئی شرمندگی نہیں اور اس گناہ سے توبہ کرنے کا بھی دھیان نہیں، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے، احساس ہوا کہ یا اللہ! مجھ

سے غلطی ہوگئی، اور پھر اس پر توبہ کرلی اور توبہ کرنے کے بعد عہد بھی کرلیا کہ آئندہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن کسی وقت پھر غیبت میں مبتلا ہوگیا تو اس موقع پر اس کو گھبرانا نہیں چاہئے، مایوس نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف دوبارہ توبہ کے لئے متوجہ ہونا چاہئے، بقول کسی کے

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نو امید نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

اگر سو بار بھی توبہ توڑی ہو تو آجاؤ میرے پاس۔

وہ شخص اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آتا ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کوئی اچھی بات ہے کہ آدمی ہر بار توبہ کرے اور پھر اس کو توڑ دے۔ نہیں۔ بلکہ کوشش تو اس بات کی پوری کرنی چاہئے کہ توبہ نہ ٹوٹے، لیکن اگر کسی وقت نفس سے مجبور ہوکر اور شیطان کے دھوکہ میں آکر گناہ کے اندر مبتلا ہوگیا اور توبہ توڑ دی تو اس وقت مایوس نہ ہو، بلکہ دوبارہ لوٹ آئے، جب یہ عمل بار بار کرتا رہے گا تو پھر یہ ہوگا کہ:

مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا

یعنی پھر وہ اعمالِ صالحہ کی طرف آجائے گا۔ یعنی اس کے بیشتر اعمال ''اعمالِ صالحہ'' ہوجائیں گے اور جب یہ ہوگا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایسی

طاقت دیں گے کہ وہ گناہ اس سے بالکل چھوٹ جائے تو پھر اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ:

فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا

یعنی صحیح معنی میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ چکا ہوتا ہے۔

نفس اور شیطان کے راستے سے لوٹ آیا

اب سوال یہ ہے کہ وہ کہاں سے لوٹا؟ اس لئے لوٹنے کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ کسی اور راستے پر جارہا تھا، وہاں سے واپس لوٹ کر آگیا، یہاں پر لوٹنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ شیطان اور نفس کے راستے سے لوٹ کر آگیا۔ اور وہ ٹھیک لوٹا ہے، یعنی اب وہ اچھی طرح تیار ہوکر باری تعالیٰ کی طرف لوٹ کر آتا ہے اور اس لوٹنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے گناہوں میں لذّت آرہی تھی، اب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں لذّت آرہی ہے، اور پہلے گناہوں کے داعیے پیدا ہورہے تھے اور وہ داعیے دماغ پر مسلط ہوگئے تھے۔ یہ شخص ان داعیوں کے آگے اپنے آپ کو مجبور پارہا تھا، لیکن وہ بندہ اس مجاہدے کے راستے سے گزرا، تو اب مجاہدے سے گزرنے کے بعد گناہوں کے داعیے یا تو پیدا ہی نہیں ہورہے ہیں یا پیدا ہورہے ہیں، لیکن وہ داعیے بہت ہی کمزور اور ناقص پیدا ہورہے ہیں۔

گناہوں کے خیالات بڑوں کو بھی آتے ہیں

اس لئے کہ گناہوں کی جھلکی بعض اوقات بڑوں بڑوں کو بھی آتی ہیں، لیکن

وہ اتنی ضعیف ہوتی ہیں کہ اس کے مقابلے میں اللہ جل شانہ کی محبت غالب آجاتی ہے اور وہ محبت غالب آکر نفس وشیطان کے تقاضوں کو شکست دیدیتی ہے۔ اب اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں لطف آرہا ہے، چنانچہ صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ شروع میں جب کوئی بندہ کام شروع کرتا ہے یا ابھی کام شروع نہیں کیا، لیکن اس کو اس بات کا احساس ہے کہ جیسا مجھے ہونا چاہئے، میں ویسا نہیں ہوں، اس موقع پر اس کا نفس ''نفسِ امّارہ'' ہے، جس کے بارے میں قرآنِ کریم نے فرمایا کہ:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (۱)

یعنی وہ نفس اس کو برائی کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے اور جب بندہ نے توبہ کی طرف قدم اُٹھایا اور اپنے ایمان کا استحضار بھی کیا، تو اَب اس کا نفس ''اَمّارہ'' سے ''لوّامہ'' کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

نفس کے ''لوّامہ'' ہونے کا مطلب

''لوّامہ'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جب وہ گناہ کرتا تھا تو اس کو برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا، اور اس کا ''ضمیر'' جاگتا ہی نہیں تھا، بلکہ اُلٹا سینہ زوری کرتا تھا کہ اس گناہ میں کیا حرج ہے؟ لیکن جوں جوں قدم بڑھانا شروع کیا اور خاص کر جب کسی شیخ یا اُستاذ کی رہنمائی میں بندہ چلا تو اب وہ دل ''لوّامہ'' بن گیا، ''لوّامہ'' کے معنی ہیں ''ملامت کرنے والا''۔ جیسا کہ حدیث شریف میں

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۵۳)

آتا ہے کہ جب آدمی دین سے بالکل غافل ہوتا ہے تو اگر جب وہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور گناہ کے وقت اس کے دل میں تھوڑا احساس بھی پیدا ہوا کہ بھائی! میں نے یہ اچھا کام نہیں کیا، تو وہ اس خیال اور احساس کو اس طرح اُڑا دیتا ہے کہ جیسے ناک پر بیٹھی مکھی کو اُڑا دیا جاتا ہے، خیال تو اس لئے آیا کہ وہ مؤمن تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نفس ابھی ''امّارہ'' ہے۔ (۱)

پھر اس کا نفس ''مطمئنہ'' بن جاتا ہے

لیکن اگر گناہ کرنے کے بعد غم ہوا، دکھ اور افسوس ہوا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کیا اور اس گناہ سے استغفار بھی کیا، تو اب وہ ''لوّامہ'' بن جاتا ہے کہ یا اللہ! میں پھر گناہ کے اندر مبتلا ہوگیا، حالانکہ میں نے تو عہد کیا تھا کہ اب گناہ نہ کروں گا، لیکن میں پھر گناہ کے اندر مبتلا ہوگیا، گویا کہ اب اس کا نفس ''لوّامہ'' بن گیا اور اُس کا ضمیر جاگ گیا اور جب ملامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار رجوع کرتا رہتا ہے اور معافیاں مانگتا رہتا ہے اور آئندہ کے لئے گناہوں سے پناہ مانگتا رہتا ہے تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی طرف ٹھیک ٹھیک لوٹ کر آجاتا ہے تو پھر اس کا نفس ''نفسِ مطمئنّہ'' بن جاتا ہے۔

''نفسِ مطمئنّہ'' سے مرتے وقت خطاب

ایسے شخص کے نفس کو مرنے کے وقت آواز دی جاتی ہے کہ:

---

(۱) صحيح البخاری ۸/ ٦٧ (٦٣٠٨)

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (۱)

اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، اس طرح لوٹ آ کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی۔ اور آ کر میرے ان بندوں میں شامل ہوجا جن کو میں نے جنت میں اپنے انعامات سے نوازا ہوا ہے اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

تزکیۂ نفس کی ترتیب

بہرحال! ''تزکیۂ نفس'' کی یہ ترتیب ہوتی ہے کہ ابتداء میں وہ نفس ''امّارہ'' ہوتا ہے، پھر وہ ''لوّامہ'' ہوتا ہے، اور اس کے بعد پھر ''مطمئنہ'' ہوجاتا ہے۔ پھر اس کو ''الحمدللہ'' اطمینان نصیب ہوجاتا ہے، اس کے بعد کبھی کبھی گناہوں کی جھلکیاں تو آتی رہتی ہیں، آخر دم تک آتی رہتی ہیں۔

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی تزکیۂ نفس کے راستے میں تراش و خراش تو چلتی رہے گی، مرتے دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ مت بیٹھنا، اپنے نفس سے بے فکر مت ہونا، اس لئے کہ یہ کسی بھی وقت ڈس سکتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الفجر: آیت (۲۷ تا ۳۰)

ایک لکڑ ہارے کا قصہ

مثنوی میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک لکڑ ہارا تھا جو جنگل سے جا کر لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا، اور ان کو بازار میں بیچ دیتا تھا، ایک مرتبہ جب لکڑیاں کاٹ کر لایا تو لکڑیوں کے ساتھ ایک بڑا سانپ بھی لپٹ کر آ گیا، اس کو پتہ نہیں چلا، لیکن جب گھر پہنچا تو تب اس نے دیکھا کہ ایک سانپ بھی آ گیا ہے، البتہ اس میں جان نہیں تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مردہ ہے، اس لئے اس لکڑ ہارے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، وہیں گھر کے اندر ہی رہنے دیا، باہر نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن جب اس کو گرمی پہنچی تو اس کے اندر حرکت پیدا ہونی شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس نے رینگنا شروع کر دیا، لکڑ ہارا غفلت میں لیٹا ہوا تھا، اس سانپ نے جا کر اس کو ڈس لیا، اب گھر والے پریشان ہوئے کہ یہ تو مردہ سانپ تھا، کیسے زندہ ہو کر اس نے ڈس لیا؟

نفس بھی ایک اژدہا ہے

یہ قصہ نقل کرنے کے بعد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس کا بھی یہی حال ہے، جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں رہ کر مجاہدات اور ریاضتیں کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں یہ نفس کمزور ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب مردہ ہو چکا ہے، لیکن حقیقت میں وہ مردہ نہیں ہوتا، اگر انسان اس کی طرف سے غافل ہو جائے تو کسی بھی وقت زندہ ہو کر ڈس لے گا، چنانچہ مولانا

رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نفس اژدہا است مردہ است
از غمے بے آلتی افسردہ است

اسی طرح انسان کا نفس بھی بعض اوقات افسردہ ہوجاتا ہے، مرجھا جاتا ہے تو نفس کے مرجھانے کو بھی غنیمت سمجھو، لیکن ساتھ ساتھ اس سے چوکنے بھی رہو کہ یہ کسی وقت ڈس بھی سکتا ہے، اس لئے آخر وقت تک اس نفس کی نگہداشت تو کرنی ہے، لیکن نگہداشت کے لئے زیادہ محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ معمولی توجہ سے آدمی گناہ سے بچ جاتا ہے، یہی معنی ہیں اس آیت کہ:

فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا

پھر غیر معمولی پریشانی نہیں ہوتی

اس کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ”شریعت طبیعت بن جاتی ہے“ یعنی شریعت کے خلاف کوئی عمل کرنے کے لئے طبیعت آسانی سے آمادہ ہی نہیں ہوتی، کبھی کسی وقت کوئی جھلک آجاتی ہے، ورنہ اطمینان کی زندگی حاصل ہوجاتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ٹھیک لوٹ آنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے بندے کو غیر معمولی پریشانی نہیں ہوتی۔ غم کا موقع آجائے، صدمہ کا موقع آجائے، تکلیف کا موقع آجائے، ایسے موقع پر اس کو اس طرح کی پریشانی اور اس طرح کی بے چینی نہیں ہوتی جو پریشانی غافل آدمی کو ہوتی ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ اور بے چینی

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہوگیا، اور بنگلہ دیش بن گیا، اس وقت پاکستان کی نوّے ہزار فوج کافروں کی قید میں چلی گئی، میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس وقت دل کے اضطراب کی کیا کیفیت تھی! اس سے کچھ عرصہ پہلے ۱۹۶۷ء میں بیتُ المقدس کا سقوط ہوا تھا، اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان چلا گیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے مجھے صبر نہیں آرہا تھا، اور بے چینی کی، پریشانی کی اور اضطراب کی وہ کیفیت تھی کہ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا، اور رات کو نیند نہیں آتی تھی، میں اپنے حضرت کے پاس گیا اور اُن سے جاکر عرض کیا کہ حضرت! میری عجیب حالت ہے، اس صورتِ حال پر مجھ سے صبر نہیں ہو رہا ہے، اور مجھے بہت بے چینی ہے۔

غیر اختیاری اُمور میں اتنی پریشانی؟

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو خود بھی اپنے صدمہ کا اظہار کیا، لیکن پھر ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ ''غیر اختیاری اُمور میں اتنی پریشانی؟'' کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت پر ایمان نہیں؟ حضرت والا کا یہ جملہ آج تک میرے دماغ میں بیٹھا ہوا ہے اور دل میں بیٹھا ہوا ہے، کیا تمہارے اختیار میں تھا کہ تم نوّے ہزار فوج کو ہندوؤں کی قید سے چھڑا دیتے؟ کیا تمہارے اختیار میں تھا کہ ڈھاکہ کو بچا لیتے؟ یہ تو غیر اختیاری امر ہے اور غیر اختیاری امر ''من جانب اللہ'' ہے اور اس کی مشیت کے تابع ہے، چاہے تمہیں اچھا لگ رہا ہو یا برا لگ رہا ہو، وہی اس عمل کی مصلحت کو جانتے ہیں۔

یہ تو کوئی طریقہ نہیں

صدمہ اپنی جگہ، غم اپنی جگہ، اس کے لئے تم "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے مانگو اور کہو کہ یا اللہ! یہ غم پیش آگیا ہے، اس کی تلافی فرمادیجئے، لیکن اتنی پریشانی کہ اضطراب ہے، بے چینی ہے، کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے، اپنا کام چھوڑے بیٹھے ہو، یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔

پھر رضا بالقضاء حاصل ہوجاتی ہے

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ "یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا" اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب پورا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ گیا تو اس میں "رضا بالقضاء" بھی آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی معاملے میں جو بھی فیصلہ فرمایا، وہ فیصلہ برحق ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا ہوا ہوں، مجھے اس سے کیا غرض کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے؟ اور کیا نہیں ہورہا ہے؟ ٹھیک ہے، جو میرے اختیار کی باتیں ہیں، مجھے انہیں صحیح کرنا چاہئے، اس میں میری جو کوشش ہوسکتی ہے وہ صرف کرنا چاہئے، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ایسا کام ہوگیا جس پر تمہیں غم ہے، صدمہ ہے، ٹھیک ہے، غم اور صدمہ کی حد تک کوئی حرج نہیں، "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرو، اس سے مانگو، اور کہو: یا اللہ! اس کی تلافی فرمادیجئے! حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ فرمایا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے سینہ پر برف رکھ دی۔

شیخ کی صحبت سے یہ چیز ملتی ہے

یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شیخ کی صحبت میسر ہوتی ہے اور شیخ کی صحبت سے جو چیز ملتی ہے وہ انسان کا رُخ بدل دیتی ہے، اور وہ ٹھیک اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آتا ہے، اور پھر اس کو اللہ تبارک و تعالیٰ سے کوئی شکوہ نہیں ہوتا اور جب شکوہ نہیں ہوتا تو غیر معمولی پریشانی بھی نہیں ہوتی، یہ نتیجہ اس بات کا ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا (۱)

توبہ کا دامن مت چھوڑو، توبہ کرتے رہو، توبہ کرتے رہو، بالآخر ایک وقت آئے گا کہ اس توبہ کے اثرات عملِ صالح کی صورت میں ظاہر ہوں گے، ان شاء اللہ اور جب ظاہر ہوجائیں گے تو پھر صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا تحقّق ہوجائے گا، پھر کائنات میں جو کچھ ہورہا ہوگا، بندہ اس پر راضی ہوگا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج معلوم کرنا

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ”اس شخص کا کیا مزاج پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں،“ یعنی کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہورہا ہے، اس شخص نے کہا کہ حضرت! ایسا تو کسی کے ساتھ آج تک نہیں ہوا، کسی پیغمبر کے

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۱)

ساتھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوا ہو، اس لئے کہ بہت سے کام انسان کی مرضی کے خلاف بھی ہوتے ہیں۔ جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میری مرضی کے مطابق اس لئے ہو رہے ہیں کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مشیت کے تابع بنا دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ چاہ رہے ہیں، میں بھی وہی چاہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف دینا چاہتے ہیں، دیدیں، میری خواہش ہے کہ مجھے تکلیف ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی غم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو میری بھی خواہش ہے کہ میں غم میں مبتلا ہو جاؤں، لہٰذا جب میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع بنا دیا، یعنی ''رضا بالقضاء'' حاصل کر لی تو ہر کام میری مرضی پر ہو رہا ہے۔

''توبہ'' کا دامن کبھی مت چھوڑنا

خلاصہ یہ نکلا کہ ''توبہ'' کا دامن کبھی بھی مت چھوڑنا، جیسا کہ حضرت بابا نجم الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر رات سونے سے پہلے توبہ کر لیا کرو، کوئی گناہ یاد آئے تو اور گناہ یاد نہ آئے تو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب استغفار فرمایا کرتے تھے تو یہ فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ! جو گناہ میرے علم میں ہیں وہ بھی معاف فرما دیجئے اور جو گناہ میرے علم میں نہیں، وہ بھی معاف فرما دیجئے۔ (۱) لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر رات توبہ کر لیا کرو۔ جب بار بار توبہ کرو گے تو ان شاء اللہ منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) صحيح البخاري ٨ / ٨٤ (٦٣٩٨)

دعا نمبر ۲۷

"عباد الرحمٰن" آٹھواں حصہ

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۲۷

دُعا

''عباد الرحمٰن'' آٹھواں حصہ

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! گذشتہ کئی مجلسوں سے ''عباد الرحمن'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے، یہ صفات اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں بیان فرمائی ہیں۔ ''عباد الرحمن'' کی اکثر صفات کا بیان گذشتہ مجلسوں میں ہو چکا، اللہ تعالیٰ ہمیں وہ صفات اپنے اندر لانے کی اور اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عباد الرحمن جھوٹی گواہی نہیں دیتے

''عباد الرحمن'' کی اگلی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا [1]

اس آیت کے دو مطلب ہیں اور دونوں بڑے ضروری ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ "عباد الرحمن" جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ "زور" کے معنی ہیں "جھوٹ"۔ "عباد الرحمن" کا یہ وصف بیان فرمایا کہ ان سے کبھی جھوٹی گواہی کا صدور نہیں ہوتا۔

گواہی دینا ایک عبادت ہے

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ آج کل "گواہی" اس کو کہتے ہیں کہ عدالت میں کوئی مقدمہ چل رہا ہے اور وہاں جا کر اس مقدمہ کے سلسلے میں کوئی آدمی قاضی کے سامنے گواہی دے تو صرف اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گواہی اور شہادت ہے۔ بیشک یہ گواہی ہے، شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر تمہیں کسی معاملے میں شہادت دینے کے لئے بلایا جائے تو تم انکار نہ کرو، کیونکہ شہادت دینا یہ بھی ایک عبادت ہے۔

آج کل گواہی دینا بڑا مشکل کام بن گیا ہے

آج کل مصیبت یہ آگئی ہے کہ "شہادت" دینا اپنے سر ایک بڑا وبال مول لینا ہے، شہادت کے نتیجے میں آدمی عدالت کے چکر لگاتا رہے گا، اس کا وقت برباد ہوگا، اس کے پیسے خرچ ہوں گے، لیکن جہاں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ:

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۲)

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا

کہ جب گواہوں کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، وہاں پر یہ بھی فرمایا ہے کہ:

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (۱)

یعنی جو گواہی دینے کے لئے آیا ہے، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، لہٰذا ایک طرف گواہوں کو تو یہ حکم دیا کہ جب تمہیں گواہی کے لئے بلایا جائے تو تم گواہی دینے کے لئے جاؤ اور دوسری طرف عدالت کو اور جو شخص گواہی کے لئے بلا رہا ہے، اس کو یہ حکم دیا کہ ہرگز اس کو تکلیف نہ پہنچانا، اور جب گواہی دینے کے لئے آئے تو اس کی گواہی سن کر آرام سے اس کو رخصت کر دو، نہ یہ کہ وہ بار بار عدالت کا چکر لگاتا رہے، یہ دو حکم ایسے ہیں جن کی خلاف ورزی کی وجہ سے عدالتوں کا کیا حال ہو رہا ہے!

اپنی رائے کا اظہار گواہی ہے

بہر حال! گواہی کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قاضی کے سامنے عدالت میں جا کر کوئی گواہی دے، لیکن شرعی اعتبار سے ''شہادت'' اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے، جب بھی کوئی آدمی کسی دوسرے کے بارے میں اپنی کوئی رائے ایسی جگہ پر ظاہر کرے جہاں پر اس رائے کی بنیاد پر دوسرا آدمی کوئی فیصلہ کرنے والا ہو تو اس وقت میں وہ جو بیان کسی شخص کے بارے میں دے گا، وہ بھی ''شہادت'' کے حکم میں ہے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۸۲)

رشتہ آنے پر اپنی رائے کا اظہار گواہی ہے

مثال کے طور پر کسی لڑکی کا رشتہ کہیں سے آیا، اب جس کے پاس رشتہ آیا ہے وہ کسی جاننے والے سے اس رشتہ کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ میرے پاس فلاں کا رشتہ آیا ہے، آپ بتائیے کہ وہ آدمی جس کا رشتہ آیا ہے وہ کیسا آدمی ہے؟ اب جو شخص بھی اس شخص کے بارے میں رائے دے گا، وہ بھی ایک طرح سے گواہی ہے، اب اگر وہ جانتا ہے کہ وہ غلط آدمی ہے لیکن پھر بھی اس نے یہ کہا کہ وہ تو ٹھیک آدمی ہے، اچھا آدمی ہے، حالانکہ اس کو پتہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے، مثلاً اس کی صحبت خراب ہے، یا اس کا کردار اچھا نہیں ہے، لیکن وہ اس کو چھپاتا ہے تو یہ بھی جھوٹی گواہی کے اندر داخل ہے اور ایسے موقع پر صحیح بات ظاہر کرنے سے اس کی غیبت بھی نہیں، بلکہ یہ عین خیر خواہی ہے کہ جو اصل حقیقت ہو، وہ بتادی جائے، اب اگر کوئی مبالغہ آمیز اس کی تعریف کرتا ہے کہ وہ تو ایسا ہے، وہ تو ویسا ہے، یہ جھوٹی گواہی ہے۔

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ضرور بتائیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، والدین کو دکھ دینا، تکلیف دینا، شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا، قرآنِ کریم میں بھی شرک کے ساتھ اس کو ذکر

فرمایا ہے کہ:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا [1]

جب تیسری چیز بتلانے لگے تو اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر آپ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دُہرایا۔ [2]

اب آپ اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے ساتھ ملاکر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دُہرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور قرآنِ کریم نے دوسری جگہ پر بھی اس کو شرک کے ساتھ ملاکر ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ [3]

یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو، اور جھوٹی بات سے بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے!

ووٹ دینا ایک گواہی ہے

اسی طرح انتخابات میں جب ہم کسی کے لئے ووٹ ڈالتے ہیں، یہ بھی ایک

---

(۱) سورۃ الاسراء: آیت (۲۳)

(۲) صحیح مسلم، ۱ / ۹۱ (۸۷)

(۳) سورۃ الحج: آیت (۳)

طرح کی شہادت ہے کہ جس شخص کو ہم ووٹ دے رہے ہیں، اس کے بارے میں گواہی دے رہے ہیں کہ ہماری نظر میں یہ شخص اس منصب کا اہل ہے۔اب اگر کسی وجہ سے، کسی دباؤ میں آکر، یا کسی لالچ میں آکر آدمی کسی غلط آدمی کو ووٹ دیدے تو یہ "شہادۃ الزور" میں داخل ہے، اور اکبر الکبائر میں سے ہے۔یہ معاملہ بہت دیکھنے اور سمجھنے کا ہے۔بعض جگہوں پر ہم سمجھتے ہیں اور ہم شہادۃ الزور کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل اس کا عام رواج ہوگیا ہے، اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں یا دوسروں کے لئے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آگئی، اب وہ کسی کے پاس گیا اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، اور جاری کرنے والے نے اس کے اندر یہ لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق و کردار بہت اچھا ہے، کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ ناجائز کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں، اس لئے کہ یہ ضرورت مند تھا، ہم نے اس کی ضرورت پوری کردی، اس کا کام کردیا، یہ تو باعث ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے لئے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کر رہا ہوں، اور کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جو آپ کو نہیں جانتا، یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلاء ہے، یہاں تک کہ جو لوگ حرام وحلال اور جائز وناجائز اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کررہے ہیں، غلط بیانی کررہے ہیں اور اس میں دُہرا جرم ہے۔ایک جھوٹ بولنے کا جرم اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم۔ چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز، روزے کے پابند، اذکار واشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا، ایک مرتبہ جب پاکستان آئے تو میرے پاس بھی ملاقات کے لئے آگئے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ واپس کب تشریف لے جارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہروں گا، میری چھٹیاں تو ختم ہوگئیں، البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لئے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوادیا ہے۔

کیا دین صرف نماز، روزے کا نام ہے؟

انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمول کی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لئے بھیج دیا ہے، ویسے اگر چھٹی لیتا تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائے گی، میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا

تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں، میں نے کہا کہ کیا دین صرف نماز، روزے کا نام ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے، اس لئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے، میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے، اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینا ضروری ہو تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے، اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا، باقی زندگی کے میدان میں جا کر جھوٹ بول رہا ہو تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

''میں نے پہلے حج نہیں کیا'' لکھنا کیسا ہے؟

اللہ بچائے! یہ بات ہمارے معاشرے میں اتنی پھیل گئی ہے کہ جب کوئی حج یا عمرہ کرتا ہے تو وہاں ایک بیان دینا پڑتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے حج نہیں کیا، حالانکہ وہ دسیوں حج کر چکا ہے، اب اگر یہ لکھے کہ ''میں نے حج نہیں کیا'' اور اس پر دستخط کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جھوٹی گواہی دے کر نفلی حج ادا کیا، بعض لوگ حیلہ کے طور پر ''حجِ بدل'' لکھوا دیتے ہیں، کہ میں حج بدل کر رہا ہوں۔ مجھے تو اس میں بھی تامل ہے، اس لئے کہ ''حجِ بدل'' تو اس کو کہا جاتا ہے کہ کوئی آدمی معذور ہے اور خود حج نہیں کر سکتا تو وہ دوسرے شخص کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیتا ہے تو وہ دوسرا شخص ''حجِ بدل'' کر رہا ہوتا ہے، اب

لوگ یہ لکھ دیتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم دادا کی طرف سے حج بدل کر رہا ہوں، یا مرحوم باپ کی طرف سے حجِ بدل کر رہا ہوں، حالانکہ باپ، دادا اپنا حجِ فرض ادا کر چکے تھے اور اب یہ صاحب ان کی طرف سے "نفلی حجِ بدل" ادا کر رہے ہیں، مجھے اس بارے میں تامل ہے کہ ایسا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہیں جھوٹی گواہی میں داخل تو نہیں ہے؟

ٹیکہ لگوائے بغیر سرٹیفکیٹ بنوانا

یا مثلاً حج یا عمرہ پر جانے کے لئے ایک ضروری "ٹیکہ" لگوانا ہے، اب ٹیکہ تو نہیں لگوایا لیکن سو روپے، پانچ سو روپے دے کر ٹیکہ لگوانے کی سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ ہے، اور جس نے وہ سرٹیفکیٹ بنایا ہے، وہ جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اب جھوٹ بول کر حج اور عمرہ کرنے جا رہے ہیں، یہ سب باتیں "جھوٹی گواہی" کے اندر داخل ہیں اور ہمارے معاشرے میں اس کو عیب سمجھا ہی نہیں جاتا۔

سرٹیفکیٹ ایک گواہی ہے

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ [1]

یاد رکھئے! یہ سرٹیفکیٹ اور یہ تصدیق نامہ شرعاً ایک گواہی ہے اور جو شخص

---

(۱) سورة الزخرف: آیت (۸۶)

اس سرٹیفکیٹ پر دستخط کر رہا ہے، وہ حقیقت میں گواہی دے رہا ہے اور اس آیت کی رُو سے گواہی دینا اس وقت جائز ہے جب آدمی کو اس بات کا علم ہو اور یقین سے جانتا ہو کہ یہ واقع میں ایسا ہے، تب انسان گواہی دے سکتا ہے، اس کے بغیر انسان گواہی نہیں دے سکتا، آج کل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن آپ نے کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، تو یہ جھوٹی گواہی کا گناہ ہوا، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔ (۱)

جھوٹی سفارش

ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے، نیک اور سمجھدار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس آرہے ہیں، یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب پاکستان جانا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کے لئے سفارش کر دیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کر دیا جائے، اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہوگیا ہے اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے، لہٰذا آپ ان کی سفارش کر دیں۔

اب آپ بتائیے! وہاں عمرے ہو رہے ہیں، حج بھی ہو رہا ہے، طواف اور سعی بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ میں یہ جھوٹ اور فریب بھی ہو رہا ہے، گویا کہ یہ

---

(۱) صحيح البخاري ٣/ ١٧١ (٢٦٥٣) وصحيح مسلم ١/ ٩١ (٨٧).

دین کا حصہ ہی نہیں ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کرکے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے، تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینا، جھوٹی سفارش لکھوالینا، یا جھوٹے مقدمات دائر کردینا، یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ [1]

یعنی جو زبان سے نکل رہا ہے، وہ تمہارے نامۂ اعمال میں ریکارڈ ہورہا ہے۔

ایسے لوگ ''عباد الرحمن'' نہیں ہوسکتے

آج نیکی صرف نماز، روزہ کی حد تک محدود ہوکر رہ گئی ہے، سچ بولنا، جھوٹ سے پرہیز کرنا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی سفارش کرنا، آج کل اس کو عیب ہی نہیں سمجھا جاتا، قرآنِ کریم فرمارہا ہے کہ ایسے لوگ ''عباد الرحمن'' نہیں ہوسکتے۔ ''عباد الرحمن'' تو وہ ہیں کہ جو جھوٹی گواہی کا کبھی تصوّر بھی نہیں کرسکتے کہ جھوٹی گواہی دیں۔ لہٰذا یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں اور جب کبھی ایسے مواقع آئیں جہاں کسی کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنی ہو، کسی کی سفارش کرنی ہو، اس وقت اس بات کو سامنے رکھنا چاہئے کہ میں کہیں جھوٹی گواہی تو نہیں دے رہا ہوں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔ بہرحال! اس آیت کے ایک معنی تو یہ ہیں۔

---

(۱) سورۃ ق: آیت (۱۸)

دوسری عورت کے بال اپنے بال سے ملانا ''زور'' ہے

اس آیت کے دوسرے معنی بھی ہیں، وہ یہ کہ لفظ ''زور'' کے لغوی معنی اگرچہ ''جھوٹ'' کے ہیں، لیکن ہر ''باطل'' چیز کو بھی ''زور'' کہا جاتا ہے، یعنی ہر وہ کام جو ناجائز ہے، باطل ہے، گناہ ہے، اس کو بھی ''زور'' کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جن خواتین کے بال چھوٹے ہوتے ہیں، وہ دوسری خواتین کے بال اپنے بالوں کے ساتھ ملا کر لمبے کر لیتی ہیں، ایسی عورتوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ (۱)

یعنی جو عورت دوسری عورت کے بال اپنے بالوں میں ملائے، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت، اور جو عورت اپنے بال دوسری عورت کو ملانے کے لئے دے، اس پر بھی اللہ کی لعنت۔

''عباد الرحمٰن'' ناجائز کاموں میں حاضر نہیں ہوتے

لہٰذا ''زور'' کے دوسرے معنی ہیں: ہر باطل، ناجائز اور گناہ کا کام۔ اس معنی کے اعتبار سے ''لا یشھدون'' کے معنی ہوں گے، وہ حاضر نہیں ہوتے۔ اس لئے ''شھد یشھد'' کے ایک معنی ''گواہی دینا'' ہے تو دوسرے معنی ''حاضر ہونا'' بھی آتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے کے جنازے میں شریک ہوتا

(۱) صحیح البخاری ۷ / ۱٦۵ (۵۹۳۳)

ہے، اس کے لئے حدیث شریف [1] میں ”شہود“ کالفظ آیا ہے کہ وہ جنازے کی نماز میں حاضر رہا، قرآنِ کریم میں ”وشاھد و مشھود“ [2] اسی معنی میں آیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ”عباد الرحمن“ رحمن کے بندے کسی جھوٹے، یا باطل، یا ناجائز، یا گناہ کے کاموں میں حاضر بھی نہیں ہوتے، یعنی جس جگہ پر کوئی گناہ کا کام ہو رہا ہے، وہاں پر وہ جاتے ہی نہیں، یعنی گناہ کے کام میں شریک ہونا، یا اس میں اعانت کرنا تو درکنار، بلکہ وہ لوگ وہاں جاتے ہی نہیں۔

گناہ اور غیبت کی محفل میں شرکت

لہٰذا جس طرح گناہ کرنا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح گناہ کی مجلس میں گناہ کی محفل میں شریک ہونا بھی ناجائز ہے، یہ بھی گناہ کا کام ہے، مثلاً گانے بجانے کی محفل ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس محفل میں کوئی آدمی صرف تماشہ دیکھنے کے لئے جائے تو بھی جائز نہیں۔ اسی طرح اگر کسی محفل میں لوگوں کا مذاق اُڑایا جارہا ہے یا اس محفل میں لوگوں کی غیبتیں ہورہی ہیں یا لوگوں پر بہتان لگائے جارہے ہیں، اس محفل میں شریک ہونا بھی حرام ہے، ناجائز ہے، یا کسی محفل میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی باتیں ہورہی ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے دین کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، اب اگر آدمی اس محفل میں شریک ہوجائے تو یہ بھی حرام ہے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا کہ:

---

(۱) صحیح البخاری ۲ / ۸۷ (۱۳۲۵)

(۲) سورۃ البروج: آیت (۳)

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ (۱)

یعنی جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اُڑایا جارہا ہو، وہاں جا کر مت بیٹھو۔ "لا یشھدون الزور" میں یہ سب صورتیں داخل ہیں۔

شادی بیاہ کی تقریبات میں "مخلوط اجتماع"

یا مثلاً آج کل شادی بیاہ کی تقریبات ہوتی ہیں، ان تقریبات میں بہت سے کام گناہ کے ہورہے ہیں، اگر یقینی طور پر پتہ ہو کہ اس تقریب میں فلاں گناہ کا کام ہوگا تو پھر حتی الامکان آدمی کو اس تقریب میں جانے سے پرہیز کرنا چاہئے، اب آج کل "مخلوط اجتماعات" کی وبا پھیل گئی ہے، مرد اور عورتیں سب ایک ساتھ اس تقریب میں شریک ہیں، اور عورتیں بھی بڑی زیب وزینت کے ساتھ اور بناؤ سنگھار کے ساتھ موجود ہیں، اور برابر میں مرد بھی ہیں اور مرد و عورتوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہے، ایسی تقریبات میں شریک ہونا "لا یشھدون الزور" کے خلاف ہے۔

مخلوط اجتماع کی تقریب کا بائیکاٹ کرو

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب مسلمانوں کے یہاں اس بات کا تصور تک نہیں تھا کہ مرد وعورت سب ایک ساتھ بیٹھ کر تقریب منا رہے ہوں گے، لیکن اب بڑھتے بڑھتے یہ حالت ہوگئی ہے کہ کسی تقریب کا غیر مخلوط ہونا نادر ہوگیا ہے، بہت کم تقریبات ایسی ہوتی ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کا الگ الگ انتظام ہو۔ یہ

(۱) سورۃ النساء: آیت (۱۴۰)

سب کیوں ہوگیا؟ اس لئے کہ جو لوگ اس مخلوط اجتماع کو برا سمجھتے ہیں، انہوں نے بھی اس پر نکیر نہیں کی، بلکہ یہ کہہ کر اس تقریب میں شریک ہوگئے کہ اگر نہیں جائیں گے تو لوگ ناراض ہوجائیں گے، ہمارے رشتہ داروں میں شادیاں ہورہی ہیں اور مخلوط ہورہی ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ کسی بڑے نے اسٹینڈ نہیں لیا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ اگر تم مخلوط اجتماع کروگے تو میں شریک نہیں ہوں گا، اگر یہ کہہ دیتے تو اس کی روک تھام ہوسکتی تھی۔

قریبی رشتہ دار شرکت سے انکار کردیں

فرض کرو کہ ایک آدمی کی بہن کا نکاح ہورہا ہے اور بھائی یہ کہہ دے کہ اگر تم مخلوط اجتماع کروگے تو میں شریک نہیں ہوں گا، وہ بھائی تبدیلی کراسکتا ہے، مگر وہ خود یہ سوچتا ہے کہ کیا کریں، زمانہ ہی ایسا ہوگیا ہے، اب حالات ہی ایسے ہیں، اگر ہم شریک نہیں ہوں تو ان کو ناگوار ہوگا، اور لوگ ناراض ہوں گے۔اب دیکھئے! کہ لوگوں کی ناراضگی کی تو اتنی فکر؟ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی کوئی فکر نہیں؟ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی فکر کے بجائے مخلوق کی ناراضگی کی فکر ہوگئی، اس لئے یہ معاملہ بڑھتا ہی چلا گیا، وہ گھرانے جن میں مخلوط اجتماع کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا، وہاں بھی مخلوط اجتماع ہورہا ہے، اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو ''مخلوط اجتماع'' میں شریک نہیں ہوسکتا، تو اس سے کہا جاتا ہے کہ ہم آپ کے لئے الگ انتظام کردیں گے اور الگ بٹھا کر کھانا کھلادیں گے۔ارے بھائی! میں الگ ہوکر اور اچھوت بن کر کیوں کھانا کھاؤں؟

ان میں شرکت ''عبادالرحمن'' کا کام نہیں

بہر حال! وہ تقریبات جن میں صریح حرام ہو رہے ہیں، ان میں شرکت کرنا ''عباد الرحمن'' کا کام نہیں، اور ''لا یشهدون الزور'' میں داخل نہیں ہے، اس لئے صاف صاف کہہ دو کہ ہم اس میں شرکت نہیں کریں گے، اوّل تو روکنے کی کوشش کریں، اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں، لیکن روکنا ممکن نہ ہو تو شرکت کرنے کے بجائے اس تقریب سے پہلے یا بعد میں اس کے پاس چلے جاؤ اور کوئی ہدیہ دینے کا دل چاہ رہا ہو تو وہ ہدیہ پہلے دے کر آجاؤ، لیکن اس تقریب میں شریک مت ہو۔

اختیاری اور غیر اختیاری میں فرق ہے

بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں، جیسے ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں، اب جہاز کے اندر مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی سفر کر رہی ہیں، اب بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ آپ لوگ جہاز میں سفر کرتے ہیں، جبکہ جہاز میں مرد اور عورتیں سب مخلوط ہوتی ہیں؟ ارے بھائی! وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، لیکن جو تقریب ہم خود کر رہے ہیں، اس پر تو ہمیں مکمل اختیار ہے، اس لئے ہمیں اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

یہ معاشرے کو سدھارنے کا طریقہ ہے

درحقیقت یہ ''لا یشهدون الزور'' والی بات معاشرے کو سدھارنے

کے لئے کہی جارہی ہے، اس لئے کہ اگر لوگوں نے ڈھیل نہ دی ہوتی اور اس کام کو گوارہ نہیں کیا ہوتا تو آج یہاں تک نوبت نہ پہنچتی، اگر پہلے ہی دن سے ”لا یشھدون الزور“ پر عمل ہوتا تو یہاں تک نوبت نہ پہنچتی۔ درحقیقت معاشرے کو سدھارنے کا ایک طریقہ ہے جو قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے کہ ایسی جگہ پر تم مت جاؤ۔ اگر تمام لوگ اس پر کاربند ہوجائیں تو رفتہ رفتہ معاشرے میں اب بھی سدھار ہوسکتا ہے۔

شادی کی تقریب کا کھانا

البتہ بعض لوگ اس میں ”مبالغہ“ بھی کرلیتے ہیں، مثلاً ایسا کام جو فی نفسہ شرعاً حرام نہیں ہے، ان کاموں پر نکیر کرنے پر زور دیا جاتا ہے اور یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جہاں یہ کام ہوگا، ہم وہاں نہیں جائیں گے، مثلاً بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر لڑکی کی شادی ہے تو اس تقریب میں جو کھانا ہے، وہ ہم نہیں کھائیں گے اور شادی کے کھانے کو حرام سمجھتے ہیں اور اس پر بعض لوگ بڑی نکیر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ برات میں نہیں جائیں گے، اور برات کا کھانا ہم نہیں کھائیں گے۔ حالانکہ یہ کوئی حرام چیز نہیں ہے، اور نہ یہ ایسی چیز ہے جس پر آدمی ایسا معاملہ کرے جس طرح حرام کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں پہلے کسی معتدل مفتی سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ کس حد تک ہم شامل ہوسکتے ہیں؟ اور کس حد تک نہیں ہوسکتے؟ اور جہاں فتویٰ کی رُو سے بتادیا جائے کہ یہ حرام ہے اور بالکل ناجائز ہے اور اس میں شریک ہونا ناجائز ہے تو پھر شریک نہ ہونے کا اہتمام کیا جائے۔

نیک مجلس، نیک صحبت فائدے سے خالی نہیں

دیکھئے! جس طرح نیک مجلس کا فائدہ ہوتا ہے، اور یہ نیک مجلس وہ ہے جہاں کوئی نیکی کی بات، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور دین کی بات ہورہی ہو، وہاں آدمی کسی بھی نیت سے چلا جائے، فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔ بعض اوقات کسی مجلس میں سنا ہوا ایک لفظ ہی انسان کی دل کی دنیا بدل دیتا ہے اور جہاں پر اللہ کے دین کی باتیں ہورہی ہوں وہاں پر فرشتے اس مجلس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں، اس لئے وہ نورانی مجلس ہوتی ہے اور اس نورانی مجلس میں آدمی چلا جائے تو اس مجلس میں بیٹھنے والا بھی نامراد نہیں ہوتا، نیک صحبت اور نیک مجلس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے۔

گناہ کی مجلس میں ظلمت اور تاریکی

اس کے برعکس جو گناہ کی مجلس ہوتی ہے، اس مجلس میں ''ظلمت'' اور تاریکی ہوتی ہے، اگر کوئی اس مجلس میں کسی وجہ سے چلا جائے، اس مجلس کی ظلمت سے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہے، جس طرح نیک لوگوں کی صحبت انسان کی زندگی میں انقلاب لاتی ہے، اسی طرح بری صحبت اور وہ مجلس جس میں گناہوں کا ارتکاب ہورہا ہو، اس مجلس میں جانے سے قلب میں ایک تاریکی پیدا ہوتی ہے، اور اس تاریکی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ گناہ کی شناعت اور نفرت دل میں کم ہوجاتی ہے، گناہ سے جتنی نفرت ہونی چاہئے، اور جتنی اس کی شناعت اور قباحت دل میں ہونی چاہئے، ویسی وہ شناعت باقی نہیں رہتی، اور جب دل سے گناہ کی قباحت کم

پڑ جائے یا ڈھیلی پڑ جائے تو پھر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ بڑھ جائے گا، اور جتنا گناہ سے دور رہے گا، اتنا ہی وہ گناہ سے محفوظ رہے گا، اور جتنا قریب جائے گا تو وہ اس گناہ سے متاثر ہوگا۔

ایسی مجالس سے پرہیز کرو

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ [1]

یعنی فواحش کا ارتکاب تو بڑی بات ہے، بلکہ فواحش کے قریب بھی مت جانا، چاہے فحاشی ظاہری ہو، یا باطنی ہو۔ بہرحال! "لا یشھدون الزور" کے اندر یہ سب باتیں داخل ہیں کہ آدمی ایسی مجلسوں سے پرہیز کرے جو غفلت کی مجلسیں ہیں، جو بندے کو اللہ کے ذکر سے اور اس کی یاد سے غافل کرتی ہیں اور جو مجلسیں گناہ کی نفرت کو دل سے کم کرتی ہیں، بہرحال! "لا یشھدون الزور" "عباد الرحمن" کی بہت بڑی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

دو لفظوں میں بے شمار ہدایات

اس سے آپ اندازہ کریں کہ ان دو لفظوں میں کتنی ہدایات موجود ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے! اور اللہ ہمیشہ ہماری صحبت کو درست رکھے۔ اور بری صحبت سے اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ اور گناہوں کی نفرت ہمارے دِلوں میں پیدا فرمادے۔ اور اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں

(۱) سورۃ الحجرات: آیت (۷)

میں نیکی کی محبت پیدا فرمادے، آمین۔ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر اِن الفاظ میں فرمایا کہ:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ نعمت عطا فرمائی کہ تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور ایمان کے تقاضوں کو تمہارے لئے خوبصورت بنادیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمہارے لئے مکروہ بنادیا، یعنی تمہارے قلوب میں اس کی نفرت پیدا فرمادی، اور گناہوں سے نفرت صحبت سے حاصل ہوتی ہے، اگر آدمی دن رات ایسے آدمی کے پاس رہتا ہے جو خود گناہ کے اندر مبتلا ہے تو اس کے نتیجے میں گناہ کی نفرت اور شناعت دل میں کم ہوجائے گی۔

شرابی کی صحبت

مثلاً آج آپ کے دل میں ''شراب'' پینے سے نفرت موجود ہے، اب اگر کوئی ''شرابی'' آدمی آپ کے پاس آجائے تو آپ کی طبیعت میں کراہیت ہوگی، لیکن آج ایک شرابی آگیا، کل دوسرا شرابی آگیا، پرسوں تیسرا شرابی آگیا، پھر چوتھا شرابی آگیا اور اس کے بعد ان کے ساتھ مجلس جمنے لگی۔اب آپ سوچیں گے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟ تو جتنی صحبت بڑھتی جائے گی، قباحت اور شناعت میں کمی آتی چلی جائے گی، لہٰذا گناہ کرنے والوں کا جتنا ساتھ

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۲)

ہوگا، جتنی صحبت زیادہ ہوگی، گناہوں کی نفرت میں کمی ہوتی چلی جائے گی، اور جب نفرت میں کمی آجائے گی تو شیطان کو موقع مل جائے گا اور وہ کسی وقت تم پرحملہ بھی کردے گا اور گناہ کے اندر مبتلا کردے گا، لہٰذا ایسی مجلسوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۲۷

''عباد الرحمٰن'' نواں حصہ

وَالَّذِیۡنَ لَا یَشۡهَدُوۡنَ الزُّوۡرَ وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعَا دعا نمبر ۲۷ ''عباد الرحمٰن'' نواں حصہ

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا خطاب

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ الفرقان کا جو آخری رکوع ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ''عبادالرحمٰن'' کی صفات بیان فرمائی ہیں، ان کا کچھ بیان کچھ عرصہ سے چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کو جو سب سے زیادہ عظیم خطاب دیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے لئے یہ فرمادیں کہ یہ میرا بندہ ہے، دنیا میں انسانوں کی طرف سے جو خطابات دیئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ بہت بڑا عالم ہے، وہ بہت بڑا صوفی ہے، وہ بہت بڑا بزرگ ہے، یا وہ علامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کے بارے میں یہ کہہ دیں کہ ''یہ میرا بندہ ہے'' تو اس سے بڑا خطاب اور اس سے بڑا اعزاز اس انسان کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بے شمار خطاب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کیسے کیسے خطاب عطا فرمائے ہیں، فرمایا کہ:

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ (۱)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لئے ہادی ہیں، آپ خوشخبری سنانے والے ہیں، آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں، اور آپ داعی ہیں، اور آپ چمکتا ہوا سورج ہیں۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ''معراج'' پر بلایا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا سب سے عظیم سفر تھا، اس کو بیان کرتے ہوئے آپ کے لئے فرمایا:

سُبْحَٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ (۲)

یعنی پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ لے گئی۔

اس موقع پر آپ کے لئے نہ تو ''رسول'' کا خطاب فرمایا، نہ آپ کو ''سراج منیر'' فرمایا، نہ ''شاہد'' نہ ''مبشر'' اور نہ ''نذیر'' فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ اپنے ''بندے'' کو لے گئی۔

---

(۱) سورۃ الأحزاب: آیت (٤٥ - ٤٦)

(۲) سورۃ الاسراء: آیت (۱)

''بندہ'' ہونے کا خطاب سب سے اعلیٰ

اس سے اشارہ فرمایا کہ اس ''بندے'' کے خطاب کے آگے دوسرے خطاب ہیچ ہیں۔ کہ یہ میرا ''بندہ'' ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ''نفس مطمئنہ'' عطا فرمادے، تو موت کے وقت ''نفسِ مطمئنہ'' سے یہ خطاب کیا جائے گا کہ:

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○ (1)

اس میں ''نفسِ مطمئنہ'' سے کہا جائے گا کہ تم میرے بندوں میں داخل ہوجاؤ، اس لئے ''بندگی'' کا اعلیٰ ترین مقام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔

عباد الرحمن کی بے شمار صفات

بہرحال! ان آیات میں نیک بندوں کو ''عباد الرحمن'' کا خطاب دیا ہے کہ یہ رحمن کے بندے ہیں اور پھر ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں کہ جن کے اندر یہ اوصاف ہوتے ہیں، وہ ''رحمن'' کے بندے ہوتے ہیں، اور وہ اس عظیم الشان خطاب کے اور تمغے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان عباد الرحمن کی بے شمار صفات کا بیان ان آیات میں فرمایا ہے جن میں سے اکثر کا بیان گذشتہ مجالس میں تفصیل سے ہوگیا، الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

(1) سورۃ الفجر: آیت (۲۷ - ۳۰)

لغویات سے شریفانہ انداز میں گزر جاتے ہیں

آگے ارشاد فرمایا کہ:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۱)

یعنی رحمن کے بندے وہ ہیں جو کسی جھوٹ یا باطل یا ناجائز اور گناہ کے کاموں میں حاضر نہیں ہوتے۔ گذشتہ مجلس میں الحمدللہ اس پر تفصیل سے عرض کر دیا تھا۔ اس آیت کا دوسرا جملہ یہ ہے کہ:

وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

قرآنِ کریم کا کیا عجیب اندازِ بیان ہے کہ پہلے جملے میں تو یہ بیان فرمایا کہ رحمن کے بندے گناہ اور جھوٹ، اور ناجائز مجلسوں میں جاتے تو نہیں ہیں، لیکن کبھی ایسی مجلسوں کے پاس سے ان کا گزر ہو جاتا ہے، مثلاً وہ کسی اور کام سے جا رہے تھے، لیکن راستے میں ایک ایسی محفل پڑ گئی جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی تھی تو اس طرح ایسی محفل کے پاس سے گزر تو ہوا، فرمایا کہ جب عباد الرحمن لغو چیز کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ شریفانہ انداز سے اور وقار سے گزر جاتے ہیں۔

''لغو'' میں نہ دنیا کا فائدہ، نہ آخرت کا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''لغو'' کا استعمال فرمایا، اور ''لغو'' اس کام کو کہتے ہیں جس کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہو، اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ ہو، ایسے

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۲)

کام کو کہتے ہیں کہ یہ بیکار ہے، بے فائدہ ہے، لیکن لوگ اس بے فائدہ کام میں لگے ہوئے ہیں، اب اس میں گناہ کے کام بھی داخل ہوگئے، مثلاً ساز وسرود کی محفل ہورہی ہے اور اس میں گانا بجانا ہورہا ہے، اور ہنسی مذاق ایسا ہورہا ہے جس میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، اب ظاہر ہے کہ یہ عمل بہت بڑا گناہ ہے، یا اس محفل میں غیبت ہورہی ہے اور ایک بے فکری کی مجلس ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی تصور نہیں، اور جس میں عذاب وثواب کا کوئی خیال نہیں، اور جس میں نیکی اور بدی کا کوئی خیال نہیں، بس جس شخص کے منہ میں جو آرہا ہے، اس کی باتیں ہورہی ہیں، اس میں جھوٹ کی پرواہ نہیں، غیبت کی پرواہ نہیں، بہتان کی پرواہ نہیں، یہ محفل لغوی محفل ہے۔

محفل میں اس کی فکر ہونی چاہئے

ذرا ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کردیکھیں کہ جب ہم کسی محفل میں بیٹھتے ہیں تو کیا ہمیں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ہمارے منہ سے کوئی بات جھوٹ کی نہ نکلے؟ اور میرے منہ سے کسی کی غیبت نہ ہو؟ کیا یہ فکر ہوتی ہے کہ کسی پر بہتان نہ لگے؟ کیا یہ فکر ہوتی ہے کہ اس محفل میں کسی کی دل آزاری نہ ہو؟ کچھ فکر نہیں ہوتی، بس بے فکری کے عالم میں ہنسی مذاق ہورہا ہے، حلال اور حرام، جائز اور ناجائز کوئی پرواہ نہیں ہوتی، یہ ہے "لغو"۔

بری محفل سے شریفانہ انداز سے گزر جاؤ

اس آیت میں قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم ارادہ کرکے تو اس "محفل"

میں نہیں گئے کہ باقاعدہ شرکت کا ارادہ کر کے گئے ہو، لیکن اتفاقاً اس محفل سے تمہارا اگزرہو گیا تو اس وقت تمہیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے عجیب لفظ استعمال فرمایا کہ:

مَرُّوْا كِرَامًا

یعنی وہ لوگ اس محفل سے شریفانہ انداز سے گزرجاتے ہیں اور ''وقار'' کے ساتھ گزرجاتے ہیں۔ اب ''شریفانہ انداز'' سے گزرنے کا کیا مطلب ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے سمجھ میں آتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیرات اور ان کے عمل سے سمجھ میں آتا ہے، اب میں نے اس آیت کا ترجمہ تو کردیا کہ وہ لوگ ''شریفانہ انداز'' سے گزرجاتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

شریفانہ انداز سے گزرنے کا پہلا مطلب

''شریفانہ انداز'' سے گزرنے کا پہلا اور ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ وہ لوگ اس مجلس میں شریک نہیں ہوتے، بس گزررہے ہیں اور گزرکر آگے چلے گئے ہیں، لیکن وہاں بیٹھتے نہیں ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ان سے لڑائی بھی نہیں لڑیں گے، اس لئے کہ ''شریفانہ انداز'' سے گزرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس مجلس میں ناجائز کام ہورہا ہے، اور اس ناجائز کام کے پاس سے یہ گزر رہے ہیں، اب یہ نہیں کہ اس مجلس میں جاکر لوگوں کو لٹھ لیکر مارنا شروع کردیں کہ تم یہ کیا حرکت کررہے ہو؟ یہاں سے بھاگو۔ یہ انداز ''شریفانہ'' نہیں ہے۔

برائیوں سے روکنے کی کوشش کرو

اس لئے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ رَأٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ (۱)

اگر تم میں سے کوئی شخص کسی جگہ پر برائی ہوتی دیکھے تو اس برائی کو اپنے ہاتھ سے ختم کرے اور اگر ہاتھ سے اس برائی کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے تو زبان سے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے اور اگر زبان سے اس کو ختم نہیں کرسکتا تو پھر دل سے اس کو برا سمجھے کہ یہ اچھا کام نہیں ہو رہا ہے۔

اگر تمام مسلمان اس حدیث پر عمل کرنے لگیں تو بالآخر برائی کو دل سے برا سمجھنا ایک تڑپ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور پھر وہ تڑپ کسی نہ کسی وقت زبان سے بھی اس برائی کو رُکوانے کی کوشش کرتی ہے اور کسی وقت ہاتھ سے رُکوانے کی بھی کوشش کرتی ہے۔

اس حدیث کو سمجھنے میں ''التباس''

اس حدیث کو سمجھنے میں لوگوں کو ''التباس'' پیدا ہورہا ہے، مثلاً اگر آپ ایسی مجلس سے گزر رہے ہیں جس میں گناہوں کا ارتکاب ہورہا ہے تو اس وقت ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ جب تم کوئی برائی ہوتی ہوئی دیکھو تو اس کو ہاتھ روک دو۔ اس حدیث کا تقاضا تو

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ٦٩ (٤٩)

یہ ہے کہ ایک لاٹھی لے کر اہلِ مجلس پر حملہ کردو اور ان سے کہو کہ یہاں سے بھاگو، یہ تم نے کیا حرکت کر رکھی ہے، بعض اوقات دماغ میں یہ بات آجاتی ہے اور اسی وجہ سے بعض لوگ اپنے آپ کو خدائی داروغہ بنا کر لوگوں کی چیزوں پر حملے کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی نے اپنے گھر کے اندر تصویر لگا رکھی ہے، آپ اس کے گھر میں مہمان بن کر گئے، آپ نے وہ تصویر دیکھی تو آپ کو یہ حدیث یاد آگئی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب برائی کو دیکھو تو اپنے ہاتھ سے اس کو ختم کردو، لہٰذا میں لاٹھی لے کر اس تصویر کو توڑ دوں۔ بعض لوگ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھتے ہیں۔

حدیث کا صحیح مطلب

خوب سمجھ لیجئے! اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین درجے جو بیان فرمائے ہیں، ان میں سے جو پہلا درجہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس برائی کو روک دو، اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کا کسی جگہ پر اقتدار ہو، مثلاً ایک آدمی کا اپنے گھر پر اقتدار ہوتا ہے، اس لئے کہ مرد اپنے گھر میں "ہیڈ آف فیملی" ہے، اور جو اپنے خاندان کا سربراہ ہے، اس کو اپنے گھر پر اقتدار حاصل ہے، اب اگر گھر کے اندر وہ کسی برائی کو یا کسی ناجائز کام کو ہوتا دیکھتا ہے تو اس سربراہ کے لئے صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس برائی کو ہاتھ سے ختم کرنا ضروری ہے۔

تصویر والا پردہ لٹکانے کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکایا، جس پر تصویر بنی

ہوئی تھی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس کو دیکھا تو دروازے پر کھڑے ہو گئے اور کمرے میں داخل نہیں ہوئے، فرمایا کہ اس پردے کو ہٹاؤ، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس پردہ کو ہٹایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داخل ہوئے، اس لئے کہ آپ کو اپنے گھر پر اقتدار حاصل تھا۔[1]

آج کل اس میں افراط اور تفریط ہوتی ہے، اب ایک شخص گھر کا سربراہ ہے اور اس کو اقتدار حاصل ہے، وہ اپنے عمل سے ایک برائی کو گھر سے دور کر سکتا ہے، لیکن وہ نہیں کرتا، اس کا یہ عمل گناہ ہے، اس لئے کہ اس کے فرائض میں داخل ہے کہ اپنے گھر میں کوئی برائی دیکھ رہا ہے تو اس کو اپنے ہاتھ سے ختم کرے، اگر ختم نہیں کرے گا تو آخرت میں پکڑ ہوگی، ایک شخص ایک ادارہ کا سربراہ ہے اور اس کو اس ادارے میں اقتدار حاصل ہے، اس لئے اس کا فریضہ ہے کہ اگر اس ادارے میں کوئی منکر کام یا کوئی برائی ہو رہی ہے تو وہ اپنی قوت سے اور اقتدار کی طاقت سے ختم کرے۔ اسی طرح اگر ایک شخص پورے ملک کا سربراہ ہے تو اس کے لئے بھی صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں ہے کہ کسی برائی کے بارے میں لوگوں سے صرف یہ کہہ دے کہ یہ کام برا ہے، مت کیا کرو، بلکہ اگر ملک کے اندر کوئی برائی ہو رہی ہے تو اپنے اقتدار کے ذریعہ اس برائی کو روکے۔ لہٰذا اس حدیث کے پہلے جملے کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو کسی جگہ پر اقتدار حاصل ہو، لہٰذا ہر آدمی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ برائی کو ہاتھ سے روکے، اور ہر وقت ہاتھ میں ڈنڈا لے کر پھرے، اور جہاں خلاف شرع کام ہو رہا ہو تو وہ ڈنڈے سے اس کو دور کرے۔

(۱) صحیح البخاری ۷ / ۱۶۸ (۵۹۵٤)

عبادالرحمن لڑائی جھگڑا نہیں کرتے

بہرحال! اس آیت میں یہ جو فرمایا کہ ''مرّوا کراما'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اس گناہ کو برا تو سمجھ رہے ہیں، لیکن چونکہ اقتدار حاصل نہیں ہے، اس لئے اس جگہ سے ''شریفانہ'' طور سے گزر جاتے ہیں اور لڑائی جھگڑا نہیں کرتے، اس لئے کہ لڑائی جھگڑا ایسی چیز ہے کہ شریعت نے ہر ہر قدم پر اس کو روکنے کی کوشش کی ہے، اس لئے کہ یہ بہت خراب چیز ہے۔

شریعت نے قربانی دیدی

جھگڑا کرنا اتنی خراب چیز ہے کہ بعض مواقع پر شریعت نے اہم شرعی کاموں کی قربانی دیدی ہے کہ یہ کام شرعاً پسندیدہ اور مستحب تھا، لیکن اگر اس کے نتیجے میں جھگڑے کا اندیشہ ہو تو اس کو چھوڑ دو، تا کہ جھگڑا پیدا نہ ہو۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اس لغو اور گناہ میں خود شامل نہیں ہوں گے اور دوسرے یہ کہ اس گناہ کو روکنے کے لئے طاقت استعمال نہیں کریں گے، اب اگر وہاں جا کر شور مچا دیا تو یہ کسی طرح مناسب نہیں، بلکہ اس جگہ سے شریفانہ طریقے سے گزر جائیں۔

شریفانہ طور پر فہمائش کرنا بھی داخل ہے

اور ''شریفانہ انداز'' میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر اس بات کا گمان ہو کہ اگر میں ان میں سے کسی سے کوئی بات کروں گا اور اس برائی پر ان کی فہمائش کروں گا تو شاید یہ لوگ باز آجائیں گے تو شریفانہ طور پر اس کی فہمائش کرنا بھی

"مروا کراما" میں داخل ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ "فان لم یستطع فبلسانه" یعنی جب ہاتھ سے برائی کو نہیں روک سکتے تو کم از کم زبان سے روکے، البتہ زبان سے روکنا بھی اس وقت ہے جب زبان سے روکنے میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو اور کہنے والے کو یہ اطمینان ہو کہ اگر میں بات کروں گا تو یہ لوگ سن لیں گے اور اگر غالب گمان یہ ہو کہ میرے کہنے کے نتیجے میں یہ لوگ اس برائی سے رُک جائیں گے تو اس وقت زبان سے کہنا واجب ہے، اگر یہ خیال ہو کہ میری بات نہیں مانیں گے تو پھر واجب نہیں۔

فریضہ ادا کرنا اچھا ہے، واجب نہیں

اور اگر یہ خیال ہو کہ یہ لوگ بات تو نہیں مانیں گے، لیکن کہنے کے نتیجے میں کوئی فتنہ بھی نہیں ہوگا اور کم از کم میں اپنا فریضہ تو ادا کردوں تو اپنا فریضہ ادا کرنا اچھی بات ہے، واجب نہیں ہے، اس لئے کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ[1]

اگر آج میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو کل سمجھ میں آجائے گی اور اگر یہ خیال ہو کہ بات کرنے کے نتیجے میں اُلٹا یہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہوجائیں گے اور اُلٹا یہ لوگ دین کی توہین کرنا شروع کردیں گے اور دین کے حکم کو مذاق بنانا شروع کردیں گے تو اس صورت میں زبان سے بھی نہ کہنا چاہئے، بلکہ اس موقع پر صرف دل سے برا سمجھ لینا کافی ہے۔

---

(۱) سورة الذاريات: آيت (۵۵)

''شریفانہ انداز'' سے گزرنے کے تین طریقے

بہرحال! ''شریفانہ انداز'' میں گزر جانے کا ایک معنی یہ ہے کہ وہ خود اس برائی میں شریک نہیں ہوں گے اور دوسرے یہ کہ اس برائی کو روکنے کے لئے جہاں اقتدار نہ ہو، لڑائی جھگڑے سے پرہیز کریں گے اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ اگر کچھ کہنے سے فائدہ ہونے کی توقع ہو تو وہاں زبان سے محبت اور پیار سے اور شفقت سے کہہ دیں گے اور جہاں ہاتھ سے روکنے کی طاقت ہو، وہاں پر ہاتھ سے روکیں گے۔

''شریفانہ انداز'' سے گزرنے کا چوتھا طریقہ

چوتھی بات یہ ہے جو بہت اہم بات ہے، وہ یہ کہ آپ ایک آدمی کو گناہ کرتا دیکھ رہے ہیں، یا ایک جماعت کو مجلس میں گناہ کرتا دیکھ رہے ہیں، اور اُوپر کے تینوں درجے پر آپ کو عمل کرنے کی طاقت نہیں ہے، تو اس صورت میں آپ اس عمل کو دل سے برا سمجھیں گے کہ یہ غلط کام ہو رہا ہے، اور اس کی طرف سے طبیعت میں ایک انقباض پیدا ہو کہ یہ کام اچھا نہیں ہو رہا ہے، یہاں پر لوگ غیبت کر رہے ہیں، یہاں پر لوگ بہتان باندھ رہے ہیں، یہاں پر گانا بجانا ہو رہا ہے، وغیرہ۔ لیکن جو لوگ اس گناہ میں مبتلا ہیں، ان کی تحقیر آپ کے دل میں نہ آنی چاہئے۔

اس عمل کو برا سمجھے، ذات کو نہیں

یہ ہے ''نکتہ'' اور یہ ہے ''پل صراط'' کہ اس کے عمل کو تو برا سمجھ رہے ہیں

اور اس کام سے بیزاری کا اظہار بھی کر رہے ہیں اور دل میں اس عمل کی کراہیت بھی ہے اور نفرت بھی ہے، لیکن اس آدمی سے نفرت نہیں ہے، لہٰذا برا عمل کرنے والوں کو یہ سمجھنا کہ یہ تو فاسق فاجر لوگ ہیں، یہ تو جہنمی ہیں اور یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی طرف دیکھا جائے، یہ تو جہنم میں جائیں گے اور میں تو ان کو گھاس بھی نہیں ڈالتا، اگر ان لوگوں کی تحقیر کا خیال آپ کے دل میں آگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے آپ کو بہکا دیا اور یہ ''شریفانہ انداز'' میں گزرنا نہ ہوا، اس لئے کہ ''شریفانہ انداز'' میں گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عمل کو برا سمجھے، ان کی ذات کو برا نہ سمجھے اور اس عمل کی تحقیر ہو، عمل کرنے والے کی تحقیر نہ ہو۔

ذات کو حقیر نہ سمجھنے کی دلیل

اس بات کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے، آسان نہیں ہوتا، اب سوال یہ ہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آپ اس کی ذات کو حقیر نہیں سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کے عمل کو برا سمجھ رہے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے دل میں یہ بات ہو کہ اگر کسی وقت یہ شخص اس گناہ سے باز آجائے گا تو میں اس شخص کو اپنے سینے سے لگالوں گا، اور ہوسکتا ہے کہ یہ شخص اس گناہ سے توبہ کرلے اور مجھ سے بھی آگے بڑھ جائے۔

ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے، جو بڑے درجہ کے صوفی بزرگ تھے، اور بڑے

متبعِ سنت تھے، انہی کے زمانے میں ایک دوسرے بزرگ بھی تھے، وہ بھی بڑے اللہ والے تھے، لیکن پہلے بزرگ کو دوسرے بزرگ سے کسی فعل پر اختلاف تھا، جس فعل کو پہلے بزرگ بدعت سمجھتے تھے کہ یہ فلاں بدعت کا کام کرتے ہیں، جیسے صوفیاء کرام کے یہاں ''سماع''، ''مولود'' اور ''قیام'' ہوتا تھا، پہلے بزرگ جو اس فعل کو بدعت سمجھتے تھے، وہ بہت سخت بیمار ہوگئے اور مرنے کا وقت آگیا، دوسرے بزرگ ان کی عیادت اور ملاقات کے لئے آئے، اندر پیغام بھیجا کہ فلاں صاحب آپ کی عیادت اور سلام کرنے کے لئے آئے ہیں، پہلے بزرگ نے جوابی پیغام بھیجا کہ اگر ویسے وہ ملاقات کے لئے آتے تو میں ان کا اکرام کرتا، لیکن میں اب دنیا سے جارہا ہوں، اور یہ میری زندگی کے آخری اوقات ہیں، اس آخری وقت میں کسی ''بدعتی'' سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا، اب یہ ان کی کیفیت تھی کہ میرا آخری وقت ہے اور جب وہ اندر آئیں گے تو مجھے ان کا اکرام کرنا پڑے گا اور ان کے اکرام کرنے سے ان کی بدعت والے فعل کے اکرام ہونے کا اندیشہ ہے۔

''بدعتی'' اپنی بدعت سے توبہ کر کے آیا ہے

پیغام لے جانے والے نے باہر جا کر بتادیا کہ وہ یہ فرمارہے ہیں، ان بزرگ نے فرمایا کہ میری طرف سے ان کو یہ پیغام پہنچادیں کہ ''بدعتی'' اپنی بدعت سے توبہ کر کے آیا ہے۔ ان صاحب نے وہ پیغام اندر پہنچادیا تو ان بزرگ نے اپنے سر سے ''عمامہ'' اُتارا اور پیغام لانے والے سے کہا کہ اس ''عمامہ'' کو کھول کر ان کے راستے میں بچھادو، اور ان سے کہو کہ میرے ''عمامہ'' پر چل کر اندر آجائیں۔

کیوں کہا؟ اس لئے کہ نفرت ''بدعت'' سے تھی، آدمی سے نفرت نہیں تھی، اور اس کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ میں ان کے سامنے کچھ نہیں، میرا ''عمامہ'' کچھ نہیں، اس لئے وہ میرے ''عمامہ'' پر پاؤں رکھ کر اندر تشریف لائیں۔

گناہ سے نفرت ہو، آدمی سے نہیں

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ آدمی ''گناہ'' سے نفرت کرے، آدمی سے نفرت نہ کرے، لیکن یہ کام ذرا مشکل اور نازک ہے، اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے ایک شخص بیمار ہے، اب بتاؤ کہ وہ بیمار ترس کھانے کی چیز ہے، یا غصہ کرنے کی چیز ہے؟ کہ تو کیوں بیمار ہو گیا؟ نہیں، بلکہ اس بیمار پر تم ترس کھاؤ گے کہ یہ بیچارہ بیمار ہو گیا ہے اور اس کے لئے دعا کرو گے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس بیماری سے نجات دیدے۔

وہ روحانی بیمار ہے، ترس کے لائق ہے

اسی طرح جو شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، وہ درحقیقت روحانی بیمار ہے، لہٰذا اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی بیماری کو دور فرمادے، لیکن اس کی تحقیر مت کرو۔ اس لئے فرمایا کہ ''رحمٰن کے بندے'' جب لغو کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفانہ انداز میں گزر جاتے ہیں اور ''شریفانہ انداز'' میں یہ سب باتیں داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۷

''عباد الرحمٰن'' دسواں حصہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعَا

دعا نمبر ۲۷ ''عباد الرحمٰن'' دسواں حصہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ کئی مجلسوں سے ''عباد الرحمٰن'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے، الحمدللہ! کئی صفات کا بیان ہو چکا۔ آگے ایک اور وصف کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا(۱)

یعنی ان عباد الرحمن کو ان کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں اور ان آیات کے ذریعہ ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ لوگ ان آیات پر اندھے

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۳)

بہرے بن کرنہیں گرتے۔

''گرتے'' کے لئے جو لفظ آیا ہے وہ ہے: ''یخرون'' یہ لفظ عام طور پر اس وقت استعمال ہوتا ہے جب آدمی اچھی چیز کے اُوپر اس کے اشتیاق میں لپک کر آگے بڑھے اور گرجائے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ:

يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا (1)

یعنی نیک لوگ اپنی ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا اشتیاق ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس پر گرتے ہیں۔

اندھے بہرے بن کرنہیں گرتے

لہٰذا ایک طرف تو اس آیت میں ''گرنے'' کا ذکر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندے ''اشتیاق'' کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اپنے پروردگار کی آیات کی طرف اپنا ''اشتیاق'' ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ''اشتیاق'' کے باوجود وہ آیات قرآن پر اندھے اور بہرے بن کرنہیں گرتے، بلکہ ان میں تدبر اور غور وفکر بھی کرتے ہیں اور ان آیات کا جو اصل مقصد اور روح ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نہیں کہ آنکھیں بند کرکے تلاوت کرتے ہیں۔

اس آیت میں منافقین کی طرف اشارہ

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے اشارہ ہے منافقین کے عمل کی طرف

(1) سورۃ الاسراء: آیت، (107)

کہ منافقین یہ کرتے تھے کہ وہ بظاہر تو قرآنِ کریم کی طرف اپنا اشتیاق ظاہر کرتے تھے کہ ہم تو قرآنِ کریم سننے کے اور اس کی نصیحت سننے کے بڑے مشتاق ہیں، لیکن جو نصیحت کی گئی ہے اس سے ان کے کان بند ہوتے ہیں اور آنکھیں بند ہوتی ہیں، یعنی ان نصیحتوں پر عمل کرنے کا کوئی سوال نہیں، لہٰذا مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں ''منافقین'' کا ذکر کیا ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ

ایک منافق وہ ہوتے تھے جن کی زبان پر اسلام تھا اور دل میں ایمان نہیں تھا، لیکن اگر ہم اپنے حالات پر غور کریں تو اس آیت میں ہمیں تنبیہ کی جارہی ہے، اس لئے قرآنِ کریم کے ساتھ جو ہمارا سلوک ہے وہ یہ کہ بظاہر قرآنِ کریم کی بڑی تعظیم اور تکریم ہے اور قرآنِ کریم اُوپر رکھا جائے، نیچے نہ رکھا جائے، قرآنِ کریم کو اعلیٰ درجے کے غلاف میں لپیٹ کر رکھا جائے، اس کی طباعت میں چمک دمک ہو، اس میں خوبصورتی اور حسن کا اعلیٰ معیار ہو، اور جب کوئی جلسہ شروع ہو تو سب سے پہلے قرآنِ کریم کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز کیا جائے، اور جب کوئی محفل منعقد ہو تو سب سے پہلے اس میں تلاوت کریں اور جب کبھی اپنی بات پر دوسرے کو یقین دلانا ہو تو اس کو ہاتھ میں اُٹھا کر لوگوں کو یقین دلائیں کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا قسم اُٹھانے کے لئے قرآنِ کریم کو استعمال کریں۔

مسلمان بھی اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر قرآنِ کریم کا اشتیاق تو بہت ہے کہ

اس کی بڑی تعظیم اور تکریم ہے، لیکن قرآنِ کریم ہمیں کیا پیغام دے رہا ہے اور وہ قرآنِ کریم ہم سے کیا چاہتا ہے، اس کی طرف بالکل توجہ نہیں ہے، نہ قرآنِ کریم کی تلاوت کی نوبت آتی ہے اور نہ اس کے سمجھنے کی طرف کوئی قدم اُٹھایا جاتا ہے، نہ اس پر عمل کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے، گویا ہم پر "صما وعمیانا" والی بات صادق آرہی ہے کہ "یخرون" کی بات بھی صادق آرہی ہے کہ ہمارے اندر اشتیاق تو موجود ہے، تعظیم اور تکریم بھی ہے، لیکن قرآنِ کریم کے حقوق سے اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔

قرآنِ کریم کا پہلا حق

بنیادی طور پر قرآنِ کریم کے تین حقوق ہیں، پہلا حق یہ ہے کہ "تلاوتِ محض" جو بذاتِ خود مقصود ہے کہ کوئی بندہ روزانہ کی تلاوت سے خالی نہ رہے۔ یہ پہلا حق ہے جو قرآنِ کریم کے حقوق میں سب سے آسان حق ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ کی روح قبض کی جائے گی اور اس کو قبر میں رکھا جائے گا تو جو شخص دنیا میں قرآنِ کریم کی تلاوت میں مشغول ہوگا، اور قرآنِ کریم کی فہم اور اس کی تبلیغ اور دعوت میں مشغول ہوگا تو قبر میں وہ قرآنِ کریم اس کے سرہانے ہوگا اور عذاب کو اس کے پاس آنے سے رکاوٹ بنے گا۔[1]

عذابِ قبر سے حفاظت کا طریقہ

عذابِ قبر برحق ہے اور یہ عذاب صرف کافروں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ

(۱) تفسیر یحیی بن سلام ۱ / ۲۸۶

مسلمانوں کو بھی ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص دنیا کے اندر قرآنِ کریم کی خدمت میں مشغول رہا ہوگا تو قبر میں وہ قرآنِ کریم اس کی حفاظت کے لئے اس کے سرہانے بیٹھا ہوگا اور دائیں طرف اس کے نماز ہوگی اور بائیں طرف روزہ ہوگا اور پاؤں کی طرف صدقہ خیرات ہوگا، لہٰذا اگر عذاب اس کے سر کی طرف سے آئے گا تو قرآنِ کریم اس عذاب کو روکے گا، اگر داہنی طرف سے عذاب آئے گا تو نماز اس عذاب کو روکے گی، بائیں طرف سے عذاب آئے گا تو روزہ روکے گا اور اگر پاؤں کی طرف سے آئے گا تو صدقہ خیرات روکیں گے۔ لہٰذا پہلا حق قرآنِ کریم کا ''تلاوت'' ہے، کوئی دن تلاوت سے خالی نہ ہو۔

تلاوت چھوڑنے پر وعید

اور اس کے مقابلے میں اس پر وعید بڑی سخت ہے کہ اگر کسی شخص نے قرآنِ کریم کا علم حاصل کیا اور مثلاً وہ حافظ قرآنِ کریم ہوگیا، لیکن پڑا سوتا رہا، اب پڑھنے اور تلاوت کرنے کی طرف دھیان اور توجہ نہیں ہے، صبح کا وقت جو قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے کا وقت ہے، وہ اس وقت پڑا سوتا رہتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ قبر میں ایسے شخص کا سر پتھروں سے کچلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کا پہلا حق ''تلاوت'' کرنا ہے، لہٰذا ہر آدمی کو سوچنا چاہئے کہ میں قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہوں یا نہیں؟

قرآنِ کریم کا دوسرا حق

قرآنِ کریم کا دوسرا حق اس کو ''سمجھنا'' اور اس میں غور کرنا۔ قرآنِ کریم

میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (۱)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور تدبر سے کام نہیں لیتے؟ یا اُن کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

ذرا سوچیں کہ اللہ جل شانہ نے کتاب ہدایت ہمارے لئے بھیجی جو اتنی بڑی نعمت ہے اور اس اُمت کو اس امتیاز سے سرفراز فرمایا کہ اس کتاب کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، فرمایا کہ:

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (۲)

کہ اس کتاب میں باطل نہیں آسکتا، نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے۔

اس میں کوئی گڑبڑ اور تحریف نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے لیا ہے، یہ بندوں کے لئے قیام تک کے لئے پیغام ہدایت ہے۔

قرآنِ کریم کی طرف سے بے توجہی

اب اگر ایک آدمی نے اس قرآنِ کریم کو اُٹھا کر طاق میں تو رکھ دیا اور تھوڑی بہت روزانہ اس کی تلاوت بھی کرلیتا ہے، لیکن کبھی اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا نہیں کہ میں دیکھوں تو سہی کہ میرے پروردگار نے اس کتاب کے

---

(۱) سورۃ الأحزاب: آیت (۴۵-۴٦)

(۲) سورۃ فصلت: آیت (۴۲)

ذریعہ مجھے کیا پیغام بھیجا ہے اور کبھی اس کتاب میں غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی ترغیب دل میں نہیں آئی؟ بلکہ اس کتاب کے سمجھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بہت سے اللہ کے نیک بندوں نے اس قرآنِ کریم کے ترجمے کرکے شائع کردیئے ہیں، اس کی تفسیر لکھ کر شائع کردی ہے، کوئی مختصر تفسیر ہے، کوئی طویل ہے، کیا کبھی دل میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ میں اس کا ترجمہ پڑھوں، اس کی مستند تفسیر پڑھوں۔

قرآنِ کریم تدبر کے ساتھ پڑھو

سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم سے نواز دیا تو وہ ذرا سمجھ لیتے ہیں، لیکن ان کا سمجھنا بھی کیا ہے؟ صرف آیتوں کا ترجمہ سمجھ لیا اور مطلب سمجھ میں آگیا کہ قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے، لیکن قرآنِ کریم کو تدبر کے ساتھ اور فکر کے ساتھ سمجھنا، یہ بات نہیں ہے، جبکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○ (۱)

"تدبر" کا کیا مطلب؟ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اپنی آیاتِ قدرت کا ذکر فرمایا ہے، ہم ان کو پڑھتے ہیں اور آگے گزر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا کہ میں نے آسمان پیدا کئے، میں نے زمین پیدا کی، اور زمین پر بارش برسائی، اور اسی بارش سے نباتات اُگائیں جو تمہارے لئے رزق ہے، تمہارے چوپاؤں کے لئے رزق ہے، تم نے یہ سب باتیں پڑھیں، اور ان کو پڑھ کر آگے گزر گئے۔

---

(۱) سورۃ الأحزاب: آیت (٤٥-٤٦)

صرف ایک آیت کے اندر ہی غور کرلیں

غور کئے بغیر صرف پڑھ کر گزر جانا اور اپنے دل میں بسائے بغیر گزر جانا، اللہ بچائے! کہیں یہ اندھے بہرے ہوکر گرنے میں شامل نہ ہو، مثلاً قرآنِ کریم نے ایک جملہ کہہ دیا، آدمی اس ایک جملے کے اندر ہی غور کرلے، فرمایا:

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ (۱)

یعنی یہ پانی جو تم پیتے ہو، اس کو بادلوں سے ہم نے اُتارا ہے یا تم نے اس کو اُتارا ہے؟

بس ایک جملہ کہہ دیا، اب آدمی اس جملے کے اندر غور کرے کہ کس طرح یہ پانی میرے پروردگار نے مجھ تک پہنچایا ہے، کس طرح سمندر بنائے، اور اس سمندر کے اندر بے شمار جانور روزانہ مرتے ہیں، لہٰذا پانی کو سڑنے سے بچانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے اندر نمکیات پیدا کردی ہیں تاکہ وہ پانی سڑے نہیں۔

سمندر میں عجیب وغریب مخلوقات

سمندر کے اندر ایسی مخلوقات ہیں جو زمین کی مخلوقات سے بدرجہا زیادہ ہے، میں نے سمندر کے اندر جاکر دیکھا ہے، سمندر کے اندر عجیب وغریب عالم ہے، اور پوری کائنات اندر بسی ہوئی ہے، پہاڑ ہیں، بڑے بڑے درخت ہیں،

(۱) سورة الأحزاب: آیت (٤٥-٤٦)

صحراء ہیں اور ایسی مخلوقات ہیں جو کبھی تصور میں نہیں آئیں، مچھلیوں کے علاوہ سمندری جانور ایک سے ایک عجیب جانور ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مخلوق کو پیدا کرنے کا کچھ مقصد ہے، اگر سمندر کے اندر ایک چھوٹی سی مچھلی تیر رہی ہے وہ ویسے ہی بیکار تو نہیں تیر رہی ہے، بلکہ اس کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے، کوئی اگر سمندر کے اندر کوئی پودا اُگا ہوا ہے، یا کوئی درخت کھڑا ہوا ہے، اس لئے کہ وہاں اندر لمبے لمبے درخت کھڑے ہیں، جیسے جنگلوں میں ہوتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت اور مصلحت کے تحت اُگ رہے ہیں۔

پانی کا قدرتی نظام

ظاہر ہے کہ یہ جتنی مخلوقات ہیں، ان سب کو زندہ رکھنا ہے، ان کو رزق بھی پہنچانا ہے اور ساتھ میں اس سمندر کو سڑنے سے بھی بچانا ہے، اس لئے نمکیات کے ذریعہ اس کے سڑنے سے حفاظت کردی۔ جب اس پانی کو انسانوں تک پہنچانے کا مسئلہ آیا ہے تو ''مون سون'' کے ذریعہ اس پانی کو بادلوں کے اندر اُوپر اُٹھا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی یہ کام کرسکتا تھا؟ اور ان بادلوں میں پانی کو میٹھا کرنے کا قدرتی پلانٹ لگا ہوا ہے، وہی نمکین اور کڑوا پانی کہ اگر ہم اس کو پینا چاہیں تو نہیں پی سکتے، اگر پی لیں تو اُلٹی ہوجائے، لیکن جب اس پانی کو بادلوں نے اُٹھایا تو وہ پانی میٹھا ہوجاتا ہے، گویا کہ یہ ''بادل'' کارگو سروس ہے اور لاکھوں ٹن پانی ان بادلوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جارہا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ جہاں چاہتے ہیں، بارش برسا دیتے ہیں اور پانی میسر ہوجاتا ہے۔

پانی کا ذخیرہ تم کر سکتے ہو؟

اب اگر انسانوں سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے بارش برسادی، اب تم خود ایک سال کیلئے اس کا ذخیرہ کر کے رکھ لو، کیا انسان کے بس میں تھا کہ ایک سال کا پانی اپنے پاس ذخیرہ کر کے رکھ لیتا؟ نہیں، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ (۱)

کہ بارش کے بعد ہم نے اس پانی کو زمین پر ٹھہرادیا۔

کس طرح ٹھہرادیا؟ اس طرح کے بارش کو پہاڑوں پر برسادیا، اور پہاڑوں پر قدرتی فریزر لگادیئے جو اس پانی کی حفاظت کر رہے ہیں، ایک طرف پانی محفوظ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اس کا منظر خوشنما ہو رہا ہے اور جس سے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں اور پانی کا پورا ذخیرہ جو پوری دنیا کے انسانوں کو سیراب کرتا ہے، وہاں موجود ہے۔

برفانی پہاڑ، کولڈ اسٹوریج

اب بارش بھی برسادی، اور پھر پہاڑوں پر بھی ٹھہرادیا، اب اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ تم جاؤ اور پہاڑوں پر سے پانی لے آیا کرو، کیا انسان کے بس میں تھا کہ وہ پہاڑ سے برف کھود کر وہاں سے پانی لے کر آئے؟ نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے سورج کو اس کام پر لگادیا کہ وہ سورج اس برف پر اپنی کرنیں نچھاور کرے اور اس برف کو پگھلائے اور پھر ندیوں کے ذریعہ اور دریاؤں کے ذریعہ وہ پانی

---

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۱۸)

تمہارے گھر تک پہنچائے۔ اور پھر ان دریاؤں اور ندیوں کی رگیں زمین کے اندر نیچے پھیلا دیں، اب تم جہاں سے کھودو گے، وہاں سے پانی نکل آئے گا، بہر حال! ہم یہ آیت أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ پڑھ کر گزر گئے، لیکن میرے مالک اور خالق نے کس طرح یہ سارا نظام بنایا ہے، اس کی طرف توجہ نہیں کی اور اس طرف غور نہیں کیا۔

زمین سے غلہ پیدا کرنے کا عمل

یہ تو میں نے ایک مثال ''پانی'' کی بیان کردی، ورنہ بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں چاروں طرف برس رہی ہیں اور ان نعمتوں کا کیسا نظم بنایا ہے؟ یہ پودے جو زمین پر اُگتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ (1)

یہ جو تم زمین کے اندر بیج بوتے ہو، اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم ہیں اُگانے والے؟

تمہارا کام تو بس اتنا تھا کہ تم نے زمین کو ہموار کر دیا، ہل چلا دیا، اور اس میں بیج ڈال دیا، کیا تمہارے بس میں ہے کہ تم اس بیج کو پودا بنا دو، کیا تمہارے بس میں ہے کہ اس بیج کو اتنی طاقت دے دو کہ وہ چھوٹی سی کونپل جو ایک اُنگلی کی بھی سہار نہیں رکھتی، وہ کونپل سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہو جاتی ہے، اس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں اور چاند اس پر اپنی روشنی نچھاور کرتا ہے، اس پر

(1) سورة الواقعة: آيت (٦٤)

ہوائیں چلتی ہیں، اس پر بارش برستی ہے، تب جا کر وہ گندم کا پودا بنتا ہے اور اس میں گندم کا خوشہ بنتا ہے اور وہ گندم کتنے مراحل سے گزر کر تم تک پہنچتی ہے۔

روٹی تم تک کس طرح پہنچی؟

ایک مخلوق ''گندم'' اُگا رہی ہے، ایک مخلوق گندم پیس رہی ہے، ایک مخلوق اس کا آٹا بنا رہی ہے، ایک مخلوق اس گندم کو بیچ رہی ہے، ایک مخلوق اس گندم کا ذخیرہ کر رہی ہے، ہم روزانہ گندم کی روٹی کھاتے ہیں، لیکن کبھی یہ سوچا کہ یہ روٹی کہاں سے آئی ہے؟ ویسے ہی نہیں آئی، بلکہ ساری کائنات کی قوتیں اس پر صرف ہوئیں، تب جا کر ایک روٹی کا نوالہ ہمارے ہاتھ میں آیا، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابر و باد ماہ و فلک و خورشید درکار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نمی خوری

یہ بادل، یہ ہوائیں، چاند، سورج، یہ آسمان، یہ سب تمہارے کام پر لگے ہوئے ہیں، تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، کس لئے لگے ہوئے ہیں؟ تا کہ تمہارے ہاتھ میں ایک روٹی آجائے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ اس کو غفلت کی حالت میں نہ کھاؤ۔

غور کے معنی ''اجتہاد کرنا'' نہیں

جس تفکر کی قرآنِ کریم دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے۔ آج کل جو لوگ ''جدیدیت'' کے علمبردار ہیں، وہ ''تفکر'' کے معنی لیتے ہیں ''اجتہاد''۔ یعنی

قرآنِ کریم میں غور کر کے "اجتہاد" کرو۔ ساری زندگی نہ کبھی قرآنِ کریم پڑھا، نہ سنا، نہ اس کو سمجھنے کی توفیق ہوئی، جب ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گئے تو اب قرآنِ کریم کی "تفسیر" لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور یہ کہنے لگے کہ چودہ سو سال سے علماء کرام نے قرآنِ کریم کے اندر غور ہی نہیں کیا، "غور" اس معنی میں کہ قرآنِ کریم سے کیا سائنسی معلومات حاصل ہوتی ہیں؟ قرآنِ کریم میں "غور" کر کے "اجتہاد" کریں کہ کس حکم کی کیا "علت" ہے؟ اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وہ "علت" پائی جارہی ہے یا نہیں؟ لہٰذا اس میں کچھ تغیر اور تبدیلی آنی چاہئے، وہ لوگ "تفکر" کو اس معنی میں لیتے ہیں۔

ایسا تفکر جو تمہیں اللہ تک پہنچا دے

خوب سمجھ لیجئے! قرآنِ کریم جس معنی میں "تفکر" کہہ رہا ہے، وہ یہ تفکر ہے جو میں نے عرض کیا، یعنی ایسا "تفکر" جو تمہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچائے، ایسا "تفکر" جو تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرے، جس کے ذریعہ تمہارا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف رہے، لہٰذا جب پانی پیو تو تمہارا دھیان اس طرف ہو کہ کس طرح میرے اللہ نے یہ پانی مجھ تک پہنچایا ہے، اور کم از کم اتنا تو کرو کہ پانی پینے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھ لیا کرو اور پانی پینے کے بعد "الحمدللہ" کہہ لیا کرو، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو، کم از کم اتنا تو کرلو۔

آیاتِ قدرت میں غور و فکر کرو

درحقیقت قرآنِ کریم میں بار بار "تدبر" اور "تفکر" کی جو دعوت دی گئی

ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے جو آیاتِ قدرت بیان فرمائی ہیں، ان پر غور وفکر کی دعوت دینا ہے، بار بار اللہ تعالیٰ کیوں فرما رہے ہیں کہ ہم نے آسمان سے پانی اُتارا ہے؟ ہم نے سورج اور چاند کو تمہاری خدمت میں لگایا ہوا ہے، ہم نے چانداور سورج کی منزلیں مقرر کردی ہیں، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے، کیوں بار بار بیان فرما رہے ہیں؟ تا کہ ہم اور آپ جب چیزوں میں غور کریں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ہمارے دلوں سے نکلے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بڑھے۔ یہ ہے ''تفکر'' کا مقصد۔

بارش کے وقت غور وفکر

بہر حال! یہ آیت

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

کہ جب وہ لوگ قرآنِ کریم پڑھتے ہیں اور اس کا مطلب سمجھتے ہیں، اس کے بعد وہ لوگ اندھے بہرے ہوکر نہیں گزر جاتے، مثلاً کسی آیت میں بارش کا ذکر ہے تو سوچا کہ ٹھیک ہے، اس میں بارش کا ذکر ہے اور بارش کا ہونا طبعی بات ہے، جب بارش ہوگی تو مزے لیں گے اور موسم اچھا ہوجائے گا، ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ بلکہ جب بارش آئے تو اس وقت انسان یہ محسوس کرے کہ میرے پروردگار نے یہ نعمت بھیجی ہے، میں اس پر شکر ادا کروں، اور میرا دل اس وقت اللہ کی محبت سے معمور ہو کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کتنا احسان کا معاملہ فرما رہے ہیں، پوری کائنات میرے لئے بنائی ہوئی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا [1]

غور وفکر کے نتیجے میں اللہ سے محبت کا تعلق

وہ ذات میری اس طرح پرورش کررہی ہے کہ پیدائش سے لے کر بچپن تک، بچپن سے جوانی تک، جوانی سے بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے موت تک، میری ساری ضروریات وہ ذات پوری کررہی ہے، اور کوئی ہے جو میری ضروریات کو پورا کرے؟ بار بار قرآنِ کریم جو ان باتوں کو ذکر کرتا ہے کہ آسمان ہم نے پیدا کیا، زمین ہم نے پیدا کی، سورج، چاند ہم نے پیدا کئے، ہوائیں ہم نے چلائیں، بارشیں ہم نے برسائیں، یہ بار بار اس لئے فرما رہے ہیں کہ تم اس کا دھیان رکھو، اور دھیان رکھنے کے نتیجے میں تمہارے دل میں اس ذات کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا ہونا چاہئے، اگر محبت کا یہ تعلق نہیں ہے تو اس سے بڑی ناشکری کوئی نہیں، اور پھر وہ محبت تمام محبتوں پر غالب آنی چاہئے۔

اس محسن ذات کے احسانات میں غور

یہ نہ ہو کہ ''احسان'' تو ایک کررہا ہے اور تم محبت دوسرے سے کررہے ہو، جس کا تم پر کوئی ''احسان'' بھی نہیں ہے، لیکن جس ذات کے احسانات میں تم جی رہے ہو، جس ذات کے احسانات میں تم صبح سے لے کر شام تک ڈوبے ہوئے ہو، کیا اس ذات سے محبت نہیں ہوگی؟ کیا اس ذات سے تعلق نہیں ہوگا؟ اس لئے قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ اندھے بہرے بن کر قرآنِ کریم کی آیات مت پڑھا

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۹)

کرو، بلکہ کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اور کھلے ہوئے کانوں کے ساتھ کائنات میں ان مناظر کا نظارہ کرو جو قرآنِ کریم بیان کر رہا ہے، اور ان مناظر سے تمہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق تک پہنچنا چاہئے۔

تم اپنی ذات میں غور کرلو

قرآنِ کریم میں فرمایا:

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ○ (۱)

یعنی اس کائنات میں غور کرنے کو چھوڑو، زمین و آسمان اور بادلوں اور ہواؤں میں غور کرنے کو چھوڑو، تم اپنی ذات میں غور کرلو، تمہارا وجود بذاتِ خود باری تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے، تم کہاں سے پیدا ہوگئے؟ کہاں سے تمہارے اندر روح آگئی؟ کہاں سے تمہارے اندر بولنے کی طاقت آگئی؟ کہاں سے تمہارے اندر چلنے، پھرنے کی طاقت آگئی؟ کہاں سے تمہارے اندر سوچنے سمجھنے کی طاقت آگئی؟ اپنے اندر ہی غور کرلو کہ سر سے لے کر پاؤں تک جو تمہارا وجود ہے، اس کی ایک ایک چیز ہم تک پہنچانے والی وہی ذات ہے۔

انسان کا ایک ایک عضو ایک کائنات ہے

سر سے لیکر پاؤں تک کس طرح انسان کا وجود بنایا گیا ہے، انسان کا ایک ایک عضو ایک کائنات ہے، میڈیکل سائنس تو میں نے نہیں پڑھی، البتہ ایک

(۱) سورۃ الذاریات: آیت (۲۱)

مرتبہ میری کمر کے مہرے کا مسئلہ ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے میں زمین پر لیٹا رہتا تھا، اس زمانہ میں بیٹھ کر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا، لیٹے لیٹے کچھ پڑھ لیتا تھا، ''مائی ڈاکٹر'' کے نام سے ایک کتاب ہاتھ لگ گئی، میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا، تا کہ یہ پتہ چلے کہ ''مہرے'' کا کیا مسئلہ ہے؟ اس کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلا کہ یہ ایک چھوٹا سا ''مہرہ'' جس میں خلل آگیا ہے، یہ ایک ''مہرہ'' پوری ایک کائنات ہے، کس طرح اس ''مہرے'' کو بنایا گیا ہے اور کس طرح اس کو ڈھالا گیا ہے، کس طرح اس کی حفاظت کی جاتی ہے، کس طرح اس کو سنبھالا جاتا ہے، آج تک کوئی انسان اپنے وجود کو نہیں سمجھ پایا، مثلاً انسان کا دماغ ہے، اس دماغ کے بے شمار حصے ہیں اور کس حصے کا کیا عمل ہے؟ پتہ نہیں، ڈر کے مارے دماغ کے حصوں کو نہیں چھیڑتے، اگر چھیڑ دیا تو اس کے نتیجے میں جسم کے کون سے حصے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔

تم نے ہر چیز اپنے پیٹ میں ڈال لی

تم کھانا کھاتے ہو، لشتم پشتم جو کھانا اچھا لگا، اس کو کھالیا، گوشت کھایا، سبزی بھی کھائی، سلاد بھی کھالی، دہی بھی کھالی، دودھ بھی پی لیا، کون ذات ہے جو اندر ان چیزوں کو الگ الگ کر رہی ہے؟ جگر کو کتنی غذا چاہئے؟ گردے کو کتنی غذا چاہئے؟ خون کس طرح بننا چاہئے؟ خون کی کس طرح گردش ہونی چاہئے؟ کون ہے جو سب کر رہا ہے؟ لہٰذا اپنے جسم اور جان کے اندر غور کرو، جب غور کرو گے تو تم لامحالہ اللہ جل شانہ تک پہنچ جاؤ گے، اس کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا، اس کے ساتھ محبت پیدا ہوگی۔

ایک چیز بار بار کیوں؟

بعض اوقات لوگ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ایک ہی بات کا بار بار تکرار ہو رہا ہے، بادلوں کا ذکر، بارشوں کا ذکر بار بار آرہا ہے، یاد رکھئے! یہ بار بار ذکر فضول نہیں آرہا ہے، بلکہ اس لئے آرہا ہے، تا کہ تم اس کو اپنے دلوں میں بساؤ، اور بسا کر اس کے ذریعہ تعلق مع اللہ پیدا کرو، اور اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا کرو، جو ذات اس طرح میری پرورش کر رہی ہے، اور ساری کائنات کو میری خدمت میں لگایا ہوا ہے، میں اس ذات سے محبت نہ کروں؟ کیا میں اس ذات کی نافرمانی کروں؟ اس کی ناشکری کروں؟ یہ احساس دل میں پیدا ہونا چاہئے۔

ایسے لوگ اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے

اگر یہ احساس پیدا ہو جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم نے کھلی آنکھوں سے اور کھلے کانوں سے یہ آیات پڑھی ہیں اور یہ آیت ''اِذَا ذُكِّرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا'' آپ پر صادق آرہی ہے، ایسا نہ کرو کہ قرآنِ کریم کی طرف اشتیاق تو بہت ظاہر کر رہے ہو، اور اس کی تعظیم اور تکریم بھی کر رہے ہو، ہاتھوں پر بھی اٹھا رہے ہو، اور سر پر بھی رکھ رہے ہو، جب دلہن کو رخصت کر رہے ہو تو اس کے سائے میں کر رہے ہو، لیکن اندھے بہرے کی طرح اس پر گر رہے ہو، نہ اس کی طرف دھیان ہے، نہ فکر ہے، نہ احساس ہے، تم ایسے نہ بنو، اس لئے کہ ''عباد الرحمن'' وہ ہوتے ہیں جو اشتیاق کی وجہ سے آیاتِ قرآنی پر گرتے تو ہیں، لیکن اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

عقل والے کون؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہوتے تھے تو آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر یہ آیات پڑھا کرتے تھے۔ آسمان کی طرف نگاہ کیوں اُٹھاتے؟ یہ اس لئے کہ غور کرتے ہوئے یہ آیات پڑھیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (۱)

”اولی الالباب“ کون ہیں؟ عقل مند لوگ۔ اس لئے فرمایا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لئے۔ عقل والے کون ہیں؟

الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ

عقل والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے بیٹھے یاد کرتے ہیں، یعنی کھڑے ہونے کی حالت میں جو منظر نظر آرہا ہے، اس کے پیچھے اللہ نظر آرہا ہے، اور بیٹھے ہونے کی حالت میں جو منظر نظر آرہا ہے، اس کے پیچھے اللہ نظر آرہا ہے، اور زبان سے یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار! آپ نے یہ سارا نظام بے فائدہ پیدا نہیں کردیا۔ (۲)

ہر چیز کے پیچھے اللہ کا جلوہ

”وعلی جنوبھم“ اگر وہ لیٹے ہوئے ہوں تو بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں،

---

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۱۹۰)

(۲) صحیح البخاری ۱ / ٤٧ (١٨٣)

یعنی ہر حال میں وہ اپنے پروردگار کو یاد رکھتے ہیں ۔

وہ کہاں کا راہ رو ہے اُسے کیا ملے گی منزل
جسے ہر قدم پر ہر سو تو ہی تو نظر نہ آئے

جب بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہوجاتا ہے تو اس کو ہر چیز کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا نور نظر آتا ہے۔ ''احسان'' کی تعریف کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (۱)

یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔

حالانکہ ہمارے اندر طاقت نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں، پھر کس طرح عبادت کریں؟ ارے اس طرح عبادت کرو کہ جو چیز بھی تمہیں سامنے نظر آرہی ہے، اس کے پیچھے ذرا غور کرو کہ کون ہے؟ تو پھر وہ عبادت ایسی ہوجائے گی جیسے کے تم اسے دیکھ رہے ہو۔

مشق کرنے سے یہ چیز ہ میں حاصل ہوجائے گی

مثلاً جب تم ہوائی جہاز کو اُڑتا ہوا دیکھتے ہو، اگر وہ مسافر طیارہ ہے تو اس کے اندر مسافر بیٹھے ہیں، اندر پائلٹ بھی موجود ہے، تو کیا تمہیں وہ مسافر نظر آرہے ہیں؟ کیا وہ پائلٹ نظر آرہا ہے؟ لیکن تمہیں اس جہاز کے اندر مسافروں کے ہونے کا ایسا یقین ہے جیسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا

---

(۱) صحیح البخاری ۱ / ۱۹ (۵۰)

جلوہ ہر طرف اس طرح یقینی ہے، اگرچہ وہ تمہیں ان آنکھوں سے نظر نہیں آرہا ہے، لیکن جو چیز بھی تمہیں نظر آرہی ہے، اس کے پیچھے اسی کا جلوہ کارفرما ہے۔

لہٰذا تم اس کی مشق کرو کہ ہر چیز کے پیچھے تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے، جب تم کھانا کھارہے ہو تو روٹی کے پیچھے نظر آرہا ہو، سالن کے پیچھے نظر آرہا ہو، جب تم کہیں باہر نکلے ہوئے ہو تو جو منظر بھی تمہیں نظر آرہا ہو، اس کے پیچھے تمہیں اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی قدرت، اس کی حکمت ہی حکمت نظر آنی چاہئے۔ یہی معنیٰ ہیں اس آیت کے کہ بہرے اندھے بن کر قرآنِ کریم نہ پڑھا کرو، بلکہ سوچ سمجھ کر پڑھا کرو، اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں بتائی ہیں، ان پر غور کیا کرو، اور جب انسان اس پر عمل کرتا رہے گا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کو ہر وقت اللہ ہی اللہ نظر آئے گا، بس! مشق کی ضرورت ہے کہ جب بھی کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا، اس کی حکمت اور مصلحت کا نظارہ کرو، اور یہ کہو:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ○ (۱)

جب کوئی اچھا نظارہ دیکھو تو یہ کہو، یہ سب واقعات، اور یہ سب نظارے تمہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل سے یہ سوجھ بوجھ عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (١٤)

دعا نمبر ۴۷ ''عباد الرحمٰن''

گیارہواں حصہ

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا

دعا نمبر ۲۷ ''عباد الرحمٰن'' گیارہواں حصہ

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز: گذشتہ کئی ہفتوں سے ''عباد الرحمن'' کی صفات کا بیان چل رہا ہے کہ ان کی کیا صفات ہیں؟ ان کی کیا خصلتیں ہیں؟ کیا ان کی عادتیں ہیں؟ کیا ان کا رویہ ہے؟ اور ان کا رویہ کیسا ہونا چاہئے؟ ان سب باتوں کا بیان چل رہا ہے، اللہ جل شانہ نے سورۂ فرقان کے آخر میں ان صفات کا بیان فرمایا ہے، اور اس کا عنوان ''عباد الرحمن'' مقرر فرمایا ہے، یعنی جو صفات آگے آنے والی ہیں وہ بندگی کا تقاضا ہے، یعنی جو اُن صفات کا حامل ہوگا وہ صحیح معنی میں رحمن کا بندہ ہوگا، ان صفات کا بیان سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں کیا گیا ہے۔

''عبادالرحمن'' کی ایک اور صفت

ان صفات میں سے بیشتر کا بیان الحمدللہ گذشتہ مجالس میں تفصیل سے ہوگیا، اب آگے ان کی ایک اور صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ (۱)

رحمن کے بندے وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں یا شوہروں ''ازواج'' کا لفظ دونوں کے لئے آتا ہے، اگر کہنے والا مرد ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ ''ہماری بیویوں میں'' اور اگر کہنے والی عورت ہو تو وہ یہ کہتی ہے کہ ''ہمارے شوہروں میں'' اور ہماری اولادوں میں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دیجئے۔ اور ہمیں متقیوں کا سردار، مقتداء اور امام بنا دیجئے۔

اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ

اس سے اشارہ اس طرف ہو رہا ہے کہ اُوپر ''عباد الرحمن'' کی جتنی صفات بیان کی گئی ہیں، وہ بندے خود تو اپنے اندر یہ صفات رکھتے ہی ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ یہ صفات ہماری ازواج اور ذرّیات کی طرف بھی منتقل ہوں، چنانچہ وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہماری اولاد بھی صحیح معنیٰ میں مسلمان بنے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (۲)

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷٤)

(۲) سورۃ المدثر: آیت (۱۲ - ۱۳)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بھی آگ سے بچاؤ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''نار'' فرمایا کہ آگ سے بچاؤ۔

لفظ ''نار'' سے ایک لطیف اشارہ

لفظ ''نار'' سے ایک بڑا لطیف اشارہ ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ہم یہ کہہ کر فارغ ہوجاتے ہیں کہ ہم نے تو اپنی اولاد کو بہت مرتبہ کہہ دیا، لیکن وہ اولاد مانتی ہی نہیں تو ہم کیا کریں؟ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی تو کافر ہوگیا تھا، ہم نے بھی اولاد کو بہت نصیحت کرلی، لیکن نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا، اس آیت میں یہ جو فرمایا کہ اپنی اولاد کو آگ سے بچاؤ، بتاؤ! اگر حقیقی آگ جل رہی ہو، اور تمہارا بچہ اس حقیقی آگ کی طرف بڑھ رہا ہو تو کیا تم اس بچے کو زبانی نصیحت کرنے پر اکتفاء کرلو گے کہ بھائی! یہ آگ بڑی خطرناک چیز ہے، اس کے قریب مت جانا! اور اس نصیحت کے باوجود وہ بچہ آگ کی طرف بڑھ رہا ہو تو کیا تم دور کھڑے ہو کر اس کو جاتا ہوا دیکھتے رہوگے؟ کوئی ماں باپ ایسا نہیں ہوسکتا جو اپنے بچے کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھے اور صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفاء کرلے، بلکہ ماں باپ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کو پکڑ کر آگ سے دور کردیں گے۔

تمہارے دل میں ایسی تڑپ ہونی چاہئے

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے دل میں اپنی اولاد کے بارے میں ایسی تڑپ ہونی چاہئے جیسی ایک چھوٹے بچے کو آگ میں کودنے سے

بچانے کے وقت ہوتی ہے، اس وقت بچے کو ڈانٹتے ہیں، نہ اس کو پھٹکارتے ہیں، بلکہ اس کو گود میں اُٹھا کر اس آگ سے دور کر دیتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی بچہ آخرت کی آگ کی طرف بڑھ رہا ہو تو اس وقت ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ صرف زبان سے نصیحت کرنے پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو محبت سے، شفقت سے، پیار سے، جہنم کی آگ سے نکالیں، اور اگر ضرورت پیش آئے تو سختی بھی کریں۔ بہرحال! یہ معاملہ جس طرح دنیا کی آگ کا ہے، اسی طرح آخرت کی آگ کا ہے۔

اپنی کوشش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا

لہٰذا ''عباد الرحمٰن'' کی صفت یہ ہے کہ وہ صرف اپنی اصلاح کی فکر کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے، بلکہ اپنی اولاد کی اصلاح اور اپنی ازواج کی اصلاح کی طرف اتنی ہی توجہ دیتے ہیں، جتنی اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ دلوں کا پلٹنا اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس لئے وہ صرف اپنی کوششوں پر بھروسہ نہیں کرتے، بلکہ کوشش کے ساتھ ساتھ اپنے پروردگار سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری ازواج کو اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیجئے۔

اولاد کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیجئے

اس طرح بھی دعا کر سکتے تھے کہ ان کو ''نیک'' بنا دیجئے یا ان کو ''متقی'' بنا دیجئے، اس کے بجائے یہ دعا کی کہ اے اللہ! ان کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک

بنادیجئے۔ ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' ایک ایسا لفظ ہے کہ اس میں ساری قسم کی خوبیاں آگئیں، اس لئے کہ ماں باپ کی آنکھ میں ٹھنڈک اولاد کی بہبود سے، اس کی بہتری سے، مثلاً ماں باپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ میرا بیٹا صحیح تعلیم حاصل کررہا ہے، پڑھنے میں اچھا جارہا ہے، اس کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک آجائے گی۔ ماں باپ دیکھ رہے ہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے، مسجد میں جارہا ہے، تو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک آجائے گی یا بیٹے کو جس طرح خدمت کرنی چاہئے، اس طرح بیٹا خدمت اور اطاعت کررہا ہے، تو اس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی یا اولاد کو دیکھا کہ وہ اچھی صحبت میں ہے اور بری صحبت سے بچے ہوئے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک آئے گی۔

مسرت اور نشاط کے سارے اسباب جمع ہیں

بہرحال! مسرت اور نشاط کے سارے اسباب اور اطمینان کے اسباب ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' کے الفاظ میں موجود ہیں، دعا کے الفاظ یہ ہیں کہ اے میرے پروردگار! میری بیوی کو بھی میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادیجئے! میرے شوہر کو بھی میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادیجئے! میری اولاد کو بھی آنکھوں کی ٹھنڈک بنادیجئے۔

اولاد کا آنکھوں کے سامنے ہونا بہتر ہے

اس دعا میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اولاد جتنی آنکھوں کے سامنے ہو، اُتنا ہی بہتر ہے، اس لئے کہ ٹھنڈک تو آنکھوں میں اس وقت پڑے گی جب

اولاد سامنے ہوگی، اگر اولاد امریکہ میں ہے اور سالہا سال تک ان کو دیکھنے کی نوبت نہیں آتی، چنانچہ آج لوگ فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا امریکہ میں پڑھ رہا ہے یا پڑھ رہا ہے یا ڈاکٹری کر رہا ہے، یا ملازمت کر رہا ہے اور اس کو وہاں پر بہت پیسے مل رہے ہیں، اب ماں باپ اسی پر خوش ہیں، لیکن ان ماں باپ سے پوچھو کہ بیٹے سے کبھی ملاقات ہوئی؟ تو پتہ چلتا ہے کہ سالہا سال سے ملاقات نہیں ہوئی، اس دعا میں اس طرف اشارہ ہے کہ ''اولاد'' ہونا ایک نعمت ہے، اور اس اولاد کا آنکھوں کے سامنے ہونا ایک مستقل نعمت ہے۔

بیٹے کا آنکھوں کے سامنے ہونا مستقل نعمت ہے

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ''ولید بن مغیرہ'' پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ''سورۂ مدثر'' میں فرمایا کہ:

وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ (۱)

کہ میں نے اس کو بڑی دولت دی پھیلی ہوئی اور بیٹے دیئے جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ''بیٹا'' ہونا ایک نعمت ہے اور بیٹے کا آنکھوں کے سامنے ہونا دوسری مستقل نعمت ہے، اس لئے کہ اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک تو اس وقت بنے گی جب وہ آنکھوں کے سامنے ہوگی، لہٰذا حتی الامکان اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ اولاد آنکھوں کے سامنے رہے اور اس کی تربیت ایسی ہو کہ اس کے کاموں کو دیکھ کر اور اس کی باتوں کو سن کر دل میں ٹھنڈک پڑے۔

---

(۱) سورۃ المدثر: آیت (۱۲-۱۳)

ہمیں متقیوں کا امام بنا دیجئے

آگے فرمایا:

وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا

اور اے اللہ! ہمیں متقیوں کا امام بنا دیجئے۔

''امام'' سے مراد یہاں پر ''سردار'' اور ''ہیڈ آف فیملی''، یعنی ہم متقیوں کے سردار اور ہیڈ بن جائیں، اور یہ اس وقت ہوگا جب ہماری ازواج اور ہماری اولاد سب متقی ہوں، یہ ہمارے لئے ایک طرۂ امتیاز ہوگا اور ایک نعمت ہوگی۔ یہ دعا ایسی ہے کہ جب بندہ کثرت سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگے تو اولاد کی تربیت اور ان کی بہتری کے لئے اور میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کے لئے مانگے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں اور پھر واقعتاً اولاد اور ازواج آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے، بشرطیکہ مانگنے والا ہو۔

کوئی ناشناس ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

التحیات کے بعد یہ دعا پڑھنے کا معمول

میں نے ایک بڑے عالم کے بارے میں سنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ! میں ہر نماز میں التحیات میں درود شریف کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے، عام طور پر لوگ اس وقت ''ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة'' والی دعا پڑھتے ہیں، بعض لوگ ''اللھم انی ظلمت نفسی ظلمـا کثیرا'' والی دعا پڑھتے ہیں،

لیکن میں نے ساری زندگی جب سے میرا نکاح ہوا، اس وقت سے میں درود شریف کے بعد یہ دعا پڑھتا تھا:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری ساری اولاد میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئی، کیونکہ میری کوئی نماز اس دعا سے خالی نہیں تھی۔

اللہ کے دربار سے رخصت ہونے کا وقت

نماز کے آخری تشہد میں درود شریف کے بعد جو دعا مانگتے ہیں، اس میں عام طور پر ہم صرف وہ دعا مانگتے ہیں جو نماز کی کتابوں میں لکھی ہوتی ہیں، انہی پر اکتفاء کرتے ہیں جیسے " ربنا آتنا فی الدنیا ... یا رب اجعلنی مقیم الصلاۃ... یا رب انی ظلمت نفسی ظلماً کثیرا"۔ لیکن درود شریف کے بعد دعا کرنے کا موقع ایسا ہے کہ اس میں کوئی ایک دعا منقول نہیں کہ ہمیشہ اسی کو مانگنا ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق دی اور جب قیام بھی ہوگیا، رکوع بھی ہوگیا، سجدہ بھی ہوگیا، قعدہ بھی ہوگیا، اب جب اللہ تعالیٰ کے دربار سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب تم یہاں سے جارہے ہو، لہٰذا ہم سے کچھ مانگ لو۔

سلام سے پہلے اولاد کے لئے دعا

جیسے آپ کسی بادشاہ کے دربار میں جائیں اور سلام دعا کرنے کے بعد اور ملاقات کے بعد وہ بادشاہ کہے کہ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کروں؟ اب اس وقت وہ آدمی بادشاہ سے بہتر سے بہتر چیز مانگے گا، اب ہمیں تو پتہ ہی نہیں کہ ہم نماز میں کیا پڑھ رہے ہیں؟ کیا مانگ رہے ہیں؟ پوری ''التحیات'' پڑھ لی، لیکن پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوگا؟ اور اس کے بعد درود شریف پڑھ لیا، اب ''سلام'' رہ گیا، اس کے بعد رخصتی ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ارے بندے! یہی وقت تو تیرے مانگنے کا ہے، اب تو مجھ سے کچھ مانگ لے، اب اس وقت یہ ضروری نہیں کہ بس ایک ہی رٹی ہوئی دعا مانگ لو، قرآنی دعائیں مانگ لو، اور احادیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنی دعائیں منقول ہیں، وہ مانگ لو اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصتی کا تحفہ ہوگا، اسی لئے نماز کے آخر میں سلام سے پہلے اپنی اولاد کے لئے یہ دعا ضرور مانگنی چاہئے۔

ان کو جنت کے بالاخانے دیئے جائیں گے

حضرت علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اولاد کے حق میں والدین کی دعا سب سے زیادہ قبول ہوتی ہے، اس لئے کبھی انسان کو مایوس ہوکر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، جب وقت آئے گا تو ان شاء اللہ یہ دعا قبول ہوجائے گی، بہرحال! ''عباد الرحمٰن'' کے تمام اوصاف بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں:

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (١)

یعنی ان لوگوں کو اعمال کے بدلے جنت کے بالاخانے دیئے جائیں گے۔

"غرفة" بالاخانے کو کہا جاتا ہے، یعنی وہ کمرہ جو اُوپر بنا ہوا ہو، اور وہاں سے سب جگہ کا نظارہ ہوسکتا ہو، ان کو انعام کے طور پر "غرفة" دیا جائے گا، وہاں سے پوری جنت کے نظارے سامنے ہوں گے، وہاں کے باغات، وہاں کی نہریں، دریا ہیں، کیوں یہ انعام دیا جائے گا؟ اس لئے کہ انہوں نے صبر سے کام لیا۔

"صبر" کامیابی کی کنجی ہے

بار بار میں یہ عرض کرتا رہتا ہوں کہ "صبر" درحقیقت کامیابی کی کنجی ہے، "صبر" کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان مشقت برداشت کرے، چاہے فرائض کی ادائیگی میں کرنی پڑے، چاہے معصیت سے رکنے میں کرنی پڑے، مثلاً کسی گناہ کا تقاضا ہورہا ہے اور اسباب میسر ہیں، اس وقت آدمی اپنے اُوپر زبردستی کرتا ہے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، اب دل مچل رہا ہے، آرزو پیدا ہورہی ہے، اسباب میسر ہیں، لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا، اور اب یہ نگاہ غلط جگہ پرنہیں اُٹھے گی، یہ زبان غلط بات نہیں نکالے گی، کوئی جھوٹ نہیں بولے گی، غیبت نہیں نکالے گی، بس اسی کا نام "صبر" ہے۔

(١) سورۃ الفرقان: آیت (٧٥)

''صبر'' کے وسیع معنیٰ ومفہوم

آج کل ''صبر'' عام طور پر صرف اس کو کہتے ہیں کہ اگر کسی کا انتقال ہوگیا تو اس پر آپ نے کوئی واویلا نہیں کیا، لیکن قرآنِ کریم کی اصطلاح میں صبر عام ہیں، کسی کے انتقال پر واویلا نہ کرنا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی رہنا بھی اس صبر کے اندر داخل ہے، لیکن اگر طاعات کی ادائیگی میں اگر مشقت ہورہی ہے، یا سستی ہورہی ہے، تو اس کا مقابلہ کرنا صبر ہے، آج بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ عبادت کی ادائیگی میں سستی ہوجاتی ہے، اس کا کوئی علاج بتادیجئے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''سستی'' کا کوئی علاج سوائے ''چُستی'' کے کوئی اور نہیں، یعنی اپنے اُوپر زبردستی کرکے اس سستی کو مٹاؤ، اگر یہ نہیں کروگے تو ساری زندگی روتے رہوگے کہ سستی ہوگئی اور کاہلی ہوگئی، کب تک کاہلی اور سستی ہوگی؟

کیا اس وقت سستی کروگے؟

اگر تمہارے پاس صدرِ مملکت کا یہ پیغام آجائے کہ تمہیں ایک لاکھ روپے بطورِ انعام دیئے جارہے ہیں، تم فوراً فلاں جگہ پہنچ جاؤ، بتاؤ کہ کیا اس وقت وہاں جانے میں سستی ہوگی، اگر اس وقت تمہیں نیند آرہی ہوگی یا سستی آرہی ہوگی تو کیا علاج کروگے؟ ''چستی'' یہ سوچو کہ وہاں تو جانا ہی ہے، چاہے جتنی بھی سستی ہورہی ہو، بلکہ سب سستی کو ختم کرکے بھاگ کر وہاں جاؤگے اور انعام وصول کرلوگے۔ لہٰذا طاعات کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں بٹ رہی ہیں، اس میں اگر سستی ہورہی ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس سستی کا مقابلہ کرو اور اس کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ اور اپنے اُوپر زبردستی کرو، اسی طرح گناہ کرنے کو

دل چاہ رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرو، اس خواہش کا مقابلہ کرو، اور زبردستی کرو، اور اپنے آپ کو اس گناہ سے روک لو، یہ ہے "صبر"، اور جنت کا سارا انعام "صبر" پر ہے، اس لئے فرمایا "بما صبروا"۔ اور پھر صبر کے بعد جنت میں پہنچو گے تو وہاں پر تمہارا استقبال کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہوگی

آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بات فرمادی، وہ یہ کہ:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ○ (۱)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ ساری دنیا کے لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہوگی، تم دوزخ میں جاتے ہو یا گناہ کے اعمال کرتے ہو۔ اللہ کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی، اگر تم اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو۔ یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے مانگنا نہیں چاہتے تو اللہ میاں کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو پرواہ اس وقت ہوگی جب تم اللہ سے مانگو گے۔ اگر تمہارا مانگنا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری پرواہ بھی نہ ہوتی۔ لہٰذا اگر تم صحیح معنی میں مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کو اپنا شعار بناؤ۔ "پکارنے" میں سب کچھ آ گیا، اس میں نماز بھی آ گئی، اس میں عبادات اور طاعات بھی آ گئیں، اس میں ذکر بھی آ گیا، اس میں دعائیں بھی آ گئیں۔

---

(۱) سورۃ الأحزاب: آیت (۴۵-۴۶)

نجات کا راستہ

مطلب یہ ہے کہ اگر تم دعا نہ مانگتے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری پرواہ بھی نہ ہوتی کہ تم کہاں جارہے ہو؟ لہٰذا تمہاری نجات کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پکارنا نہ چھوڑو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط کرو، اور اس کی عبادت وطاعت کی طرف دھیان کرو۔

آگے کافروں سے خطاب ہے کہ:

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا

بجائے اس کے کہ تم اللہ تعالیٰ کو مان کر اس سے مانگتے، اس کے بجائے تم نے میرے پیغمبر کو جھٹلادیا اور میری کتاب کو جھٹلادیا اور اب یہ تمہارا جھٹلانا تمہارے گلے پڑجائے گا، یعنی اس کا برا انجام تم دنیا میں دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے۔

اللہ تعالیٰ سے ہر وقت مانگتے رہو

اس میں ہمارے لئے یہ پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تکذیب سے محفوظ رکھا، اور ہمیں جھٹلانے سے بچالیا، اور ایمان عطا فرمادیا، اب ہمارے لئے پیغام یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو نہیں پکارو گے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری پرواہ بھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا تم ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہا کرو، اپنی چھوٹی بڑی ہر ضرورت اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور مانگتے رہنے کی عادت ڈالو، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے مانگتے رہو، اور ہر چھوٹی بڑی چیز اللہ سے مانگو، پھر ان شاء اللہ تم اللہ کے قریب ہوجاؤ گے اور

اس کے نتیجے میں تمہاری دنیا اور آخرت بہتر ہو جائے گی۔

منگتے بن جاؤ

بہرحال! آخرِ سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام دیا کہ مؤمن کے لئے سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور مانگتے رہنا''۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''منگتے بن جاؤ''۔ ''منگتا'' اس سائل اور فقیر کو کہتے ہیں جو ہر وقت مانگتا رہے، اور جس کو ہر وقت مانگنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، دیکھئے! دنیا والوں سے مانگنا تو عار اور عیب ہے، لیکن اللہ کے سامنے ''منگتا'' بننا یہ بہت بڑا مقام ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ چیز عطا فرمادے، اور یہ ساری عباد الرحمن کی صفات جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے اندر بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اُتار دے اور ہمارے عمل کو اس کے مطابق ڈھال دے، اور اس پر استقامت عطا فرما دے اور یہ صفات ہمارا ''حال'' بن جائے، اس کے بعد ہمارا ''مقام'' بن جائے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ